ملفوظات

[redacted]

مرتب

محمود نظامی

(سکرٹری حلقہ نقد و نظر لاہور)

لالہ نرائن دت سہگل نے امرت الیکٹرک پریس لاہور
میں باہتمام پنڈت دھرم چند بھارگو بی ایس سی
چھپوا کر لوہاری گیٹ لاہور سے شائع کیا

تعداد اشاعت : ایک ہزار
قیمت : چار روپے
بار اوّل

فہرس

پیش لفظ

لاہور کی فضا اُردو ادب کیلئے ہمیشہ سازگار رہی ہے۔ نت نئے وسائل، اشاعتی ادارے اور انجمنیں اس کا ثبوت ہیں۔ ان کے علاوہ صاحبِ ذوق حضرات کی مخصوص و محدود صحبتیں بھی ادب کی خدمت میں ہاتھ بٹاتی رہتی ہیں۔ ایسی ہی ایک مخصوص انجمن حلقہ نقد و نظر تھی۔ جس کے رُوح و رواں پروفیسر عبدالواحد۔ پروفیسر حمید احمد خاں اور ڈاکٹر سعید اللہ تھے۔ راقم الحروف بھی حلقہ مذکور سے متعلق تھا۔ اس کتاب کے تمام مضامین اس حلقے کے مختلف اجلاس میں پڑھے گئے تھے۔ یہ اجلاس پروفیسر عبدالواحد کی قیام گاہ پر ڈاکٹر سعید اللہ کی صدارت میں ہوا کرتے تھے جن میں لاہور کے نوجوان ادیب اور دوسرے شائقین شامل ہوتے تھے۔ یہ مضامین خاص طور پر اس انجمن کے لئے لکھے گئے تھے اور بعد میں بعض بزرگوں کی رائے سے کتابی صورت میں شائع کرنے کے لئے ترتیب دیئے گئے:

دیباچہ

کار لائل نے ہیرو اور ہیرو پرستی کے موضوع پر پوری کتاب لکھ ڈالی۔ نہ جانے کیا کچھ اس میں لکھا۔ پڑھنے والے ہیرو پرستی کے بارے میں صحیح اور غلط دونوں طرح کے نتیجے اخذ کرتے رہے لیکن زندگی کے مختلف شعبوں سے جن باعظمت لوگوں کو اس نے اپنا موضوع بنایا۔ ان کی شان میں فرق آیا نہ آن میں۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اقبال کے متعلق بھی آپ شاید یہی بات کہہ اٹھیں اس لئے اس تمہید کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اقبال

اُردو ادب کا ہیرو ہے۔ فارسی ادب کا بھی ہیرو ہے۔ اور اس کے علاوہ نہ صرف مسلمانوں کا ہیرو ہے بلکہ اس کے مردِ مومن کے نظریے کو ہم لفظ مومن کے سطحی مفہوم سے محدود نہ کردیں اور مومن کے معنی ایک آئیڈیل کے سمجھیں۔ اسے انسانیت کا آدرش جانیں تو اس صورت وہ انسانیت کا ہیرو بھی ہے۔

ہیرو اور ہیرو پرستی کچھ تو ذاتی خصائص کی بلندی کا نتیجہ ہوتی ہے اور کچھ ایک فرد کیلئے اجتماع کے احساس احسان مندی کا۔ اقبال کا بھی یہی حال ہے۔ وہ ایک بڑا شاعر تھا وہ ایک بلند پایہ فن کار تھا۔ یہ اس کے ذاتی خصائص تھے۔ اس نے اپنے خیالات اور اپنی تعلیم و تبلیغ سے لوگوں میں ایک نئی رُوح پھونکی۔ مُردہ دِلوں میں جان ڈال دی۔ وہ اپنے خیالات کو ایک پیغام کی صورت میں ہمارے سامنے لایا۔ اِس کے لئے ہم اس کے احسان مند ہیں۔

ہم نے اسے پیغمبر سمجھا لیکن اس کے اپنے سامنے جس پیغمبر کی زندگی مشعلِ راہ تھی وہ خود اس کا ایک ہلکا سایہ تو تھا۔ اور اس کی طرح اسے خود بھی تسلیم تھا کہ میں بھی تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ اقبال کی ذہنی بلندی نے یہ ظاہر کرتے ہیں کوئی عار نہ محسوس کی۔ لیکن ہم ذہنی لحاظ سے اتنے بلند نہ تھے۔ ہم یہ بھول گئے کہ وہ ایک شاعر۔ ایک پیغامبر ہوتے ہوئے بھی ایک انسان ہے اور جس طرح ہم اس کی شاعری۔ اس کے پیغام سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس طرح اس کی انسانیت کا مطالعہ بھی نہ صرف اس کے جوہر خدا داد کو سمجھنے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔ بلکہ ہمیں زندگی میں آگے بڑھا سکتا ہے۔

آج سے چند سال پہلے کچھ لوگوں نے اس پہلو سے اقبال پر غور کیا۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں حضرت علامہ کا وصال ہوا۔ اس سال کے آخر تک یہ کتاب جس میں لوگوں کے مشاہدے تجربے اور مطالعے موجود تھے اشاعت کے لئے تیار تھی۔ لیکن مسوّدہ پبلیشر کے حوالے کر دینے کے باوجود مرتب کو ترجمانی کے لحاظ سے کچھ جھجک پیدا ہوئی کیوں کہ اسوقت اقبال کا وصال ایک تازہ ملی حادثہ تھا۔ اس وقت فضا میں تعزیت کی جذبات پرستی تھی۔ ممکن تھا کہ اسوقت اگر یہ کتاب شائع کی جاتی تو اس کا اصل مقصد فوت ہو جاتا۔ عام انسانیت اپنی جبلی کمزوری کے باعث ایک ہیرو ایک انسان کی صورت میں دیکھنا پسند نہ کرتی۔ لیکن آج — آج ہم اقبال کے جانے پر جتنے آنسو بہانا چاہتے تھے بہا چکے۔ آج ہم ٹھنڈے دل سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کی موت اتنا بڑا حادثہ نہ تھی جتنا بڑا معجزہ اس کی زندگی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ التواء میں پڑی ہوئی کتاب آج آپکے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔ پیش کرنے والے کو یقین ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد ہم نہ صرف شاعرِ اعظم کے فن کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں بلکہ شاعرِ اعظم کی شخصیت کو سمجھنے میں بھی یہ ہماری ممد و معاون ہو سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ شاعرِ اعظم اور اسکے پیغام کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے اس کی شخصیت کو سمجھنا لابدی ہے۔

محمود نظامی

کیفِ غم

شیخ سر عبدالقادر

اقبال کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت اُس کا "کیفِ غم" ہے اور یہی کیفیت مرحوم کے ذاتی خصائل میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی تھی۔ جو لوگ اُن سے ملتے رہے ہیں۔ وہ خُوب جانتے ہیں کہ اعلیٰ درجہ کی ظرافت اور ہنسنے ہنسانے کی عادت کے ساتھ اُن میں یہ عجیب وصف تھا کہ سنجیدگی اور متانت بیٹھے بیٹھے ظرافت پر غالب آجاتی تھی۔ اور چہرے پر یکایک غم آمیز اثرات نظر آتے تھے۔ آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ جیسے کوئی درد انگیز خیال دفعتہً دل میں آگیا ہے۔ یہ رنگ اُن کے اشعار میں بہ کثرت پایا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ شاعر کے کلام میں اثر گدازِ دل سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ غالب کا

یہ شعر اس خیال کی ترجمانی کرتا ہے ؎

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی!

یہ نظریہ اقبالؔ کے اس مصرعہ میں اس سے بھی بلند مقام پر پہنچ گیا ہے۔ ؏

عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

اقبالؔ کے نزدیک شاعری میں غم کا عنصر شامل ہونا مشرقی شاعری کو مغربی شاعری سے متمیز کرنے والی صفت ہے۔ اُنھوں نے کیا خوب کہا ہے ؎

پیرِ مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ "کیفِ غم" نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

یہی فرق مشرق اور مغرب کے اور فنون کو ایک دُوسرے سے جُدا کرتا ہے اور خاص کر دونو کی موسیقی میں زیادہ واضح ہے۔ مغربی موسیقی جذباتِ طرب کو اُبھارنے کے لئے زیادہ موثر ہے اور مشرقی موسیقی میں عموماً جذباتِ غم کی تحریک زیادہ ہے۔

شعر سے رغبت کے ساتھ اقبالؔ کو موسیقی کا بھی بہت شوق تھا۔ ان کو علم موسیقی سے گہری واقفیت پیدا کرنے کا تو موقع نہیں ملا۔ مگر اُن کے کان موسیقی کی اچھی شناخت رکھتے تھے۔ اور کوئی گاتا ہو تو وہ اُس سے ایسا لطف اُٹھاتے تھے جیسے کوئی ماہرِ فن اُٹھائے۔ قدرت نے خود انہیں بھی اچھا گلا عطا کیا تھا۔ اس لئے کبھی کبھی بے تکلّف دوستوں کی صحبت میں اپنا کلام ترنم سے پڑھتے تھے۔ جس سے اشعار کا لطف دوبالا ہو جاتا تھا۔ وہ ہر بحر کے لئے ایسی موزُوں لَے چُن لیتے تھے۔

کہ سُننے والے مسحُور ہو جاتے۔ اس ترنم کے وقت اُن پر اکثر غم کی حالت طاری ہوتی تھی اور سُننے والے بھی اس سے اثر پذیر ہونے سے بچ نہیں سکتے تھے۔

جب انہوں نے بڑے مجمعوں اور قومی جلسوں میں شریک ہونا شروع کیا۔ تو پہلے اپنا کلام تحت اللفظ سُناتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ لوگوں کو خبر ہو گئی کہ وہ خوش آہنگ بھی ہیں تو فرمائشیں ہونے لگیں کہ لَے سے پڑھیں۔ دوستوں کے کہنے سُننے سے وہ مان گئے۔ پھر تو یہی چرچا ہو گیا۔ جب کبھی وہ تحت اللفظ پڑھنا چاہیں۔ لوگ اُنہیں ترنم پر مجبُور کر دیں۔

لاہور کی مشہور تعلیمی انجمن "حمایت اسلام" کے سالانہ اجلاس اکثر ان کے کلام سے مستفید ہوتے تھے۔ پہلے پہل جب اُن کا کلام ترنم سے وہاں سُنا گیا۔ تو کئی موزوں طبع طلبا اور بعض دُوسرے شعرا کو شوق ہُوا کہ وہ اُن کے طرز ترنم کا تتبع کریں۔ اب جسے دیکھو وہ اپنا کلام اسی طرز سے پڑھ کر سُنا رہا ہے۔ خواجہ دل محمد ایم۔ اے۔ جو اب اسلامیہ کالج میں ریاضیات کے پروفیسر ہیں اور شاعری میں بھی نام پیدا کر چکے ہیں۔ اُس وقت طالب علم تھے اور اقبال کی واز کا نمونہ پیش کرنے میں بہت کامیاب سمجھے جاتے تھے۔ اب بھی اکثر مجالس میں اُن کی لَے سُننے میں آتی ہے۔ مگر اُس میں وہ ابتدائی رنگ باقی نہیں۔

اُن دنوں دہلی کے شاہی خاندان کے ایک نامور فرد مرزا ارشد گورگانی مرحوم زندہ تھے اور فیروز پور کے سرکاری مدرسے میں فارسی پڑھانے پر مامور تھے۔ وہ بھی انجمن کے سالانہ جلسوں میں اپنی قومی نظمیں سُنایا کرتے تھے۔ جو بہت مقبول ہوتی تھیں۔ مرزا صاحب ہمیشہ تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ انہوں نے اقبالؔ کی روز افزوں قبولیت کو دیکھ کر محسُوس کیا کہ اقبالؔ کی خوش آہنگی

اس کی نظم کو پر لگا رہی ہے اور اپنی ایک نظم میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ مصرعہ لکھا۔ ع

نظمِ اقبالؔ نے ہر اک کو گویّا کر دیا

یہ بات تو درست تھی کہ بہت سے لوگ اقبال کو دیکھ کر ترنم پر آمادہ ہو گئے تھے مگر اس کی قبولیت کی اصلی وجوہ اور تھیں جو اُس وقت کے کلام میں بھی موجود تھیں اور بعد کو زیادہ پختہ ہو گئیں۔

انجمن کا ایک اجلاس جس میں اقبالؔ نے اپنی مشہور نظم "شکوہ" اپنے اندازِ خاص میں پڑھی۔ بہت لوگوں کو یاد ہو گا۔ جب "کیفِ غم" کا سماں جلسے پر چھا گیا تھا۔ اُن کے بہت سے مدّاح پھولوں سے جھولیاں بھر کر لائے تھے اور جب وہ پڑھ رہے تھے تو اُن پر پھول برسا رہے تھے۔ اُس وقت کی ایک اور بات خاص طور پر قابلِ دید تھی۔ کہ اقبالؔ کا معمّر باپ اس نظم کے سُننے والوں میں موجود تھا۔ باپ کی آنکھوں میں بیٹے کی کامیابی دیکھ کر خوشی کے آنسو تھے۔ مگر لبوں پر تاثیرِ کلام سے وہی علاماتِ غم تھیں۔ جو بیٹے کے چہرے پر تھیں درحقیقت یہ خصوصیت بیٹے نے باپ سے ورثے میں پائی تھی۔ اقبالؔ کے والد ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ مگر اُن کا رنگِ تصوّف ایسا نہ تھا کہ اُن کو زندگی کے روزمرہ فرائض سے بے پروا کر دے۔ ساری عمر اپنی دس انگلیوں کی کمائی سے روزی کمائی۔ "دل بہ یار دست بہ کار" پہ اُن کا عمل تھا۔ دل خدا کی طرف اور ہاتھ کام پر لگے رہتے تھے۔

ایک عرصہ تک اقبالؔ اپنی نظمیں ترنم سے پڑھنے کے بعد فرمائشوں کی کثرت سے تنگ آ گئے اور انھوں نے یہ اصول بنا لیا کہ کسی بڑے مجمع میں ترنم سے نہیں پڑھیں گے۔ بہت سے شائقین کو سخت مایوسی ہوئی۔ مگر مرحوم جب کوئی ایسا فیصلہ کر لیتے تھے اس پر قائم رہتے تھے۔ اس لیئے ان کی وفات سے برسوں پہلے یہ معمول ہو گیا تھا۔ کہ کسی جلسے میں اگر وہ اپنا کلام پڑھیں تو تحت اللفظ پڑھتے

تھے۔ اور دوستوں میں بیٹھے ہوئے بھی ترنم پر بہ مشکل مائل ہوتے تھے۔ آخیر میں انہوں نے خاص صحبتوں میں بھی ترنم سے پڑھنا بند کر دیا تھا۔ اس عرصہ میں ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے اور دو اور دوستوں کو اُن کی نوائے درد انگیز سُننے کا موقعہ ملا۔ وہ آواز اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ مجھے رہ رہ کر افسوس آتا ہے کہ جس زمانے میں اقبال لَے سے پڑھتے تھے۔ اُس وقت آواز کے ریکارڈ بنانے کا عام رواج نہ تھا اور کسی کو خیال نہ آیا۔ کہ اُن کے پڑھنے کی بے نظیر طرز کو مستقل طور پر مقید کر لیا جاتا۔ کیونکہ ایک خاص اثر اُن کی آواز میں تھا۔ جو سُننے سے تعلق رکھتا تھا اور لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔

جس موقعہ کا ذکر مَیں نے کیا ہے اس کی تفصیل دلچسپ ہے۔ میں نے دیرینہ اور بے تکلف دوستی کی بنا پر وہ جسارت کی۔ جس سے اقبال اپنا کلام اپنے خاص انداز میں سُنانے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۹۳۲ء میں سید سر عبدالرؤف صاحب جو لاہور کی ہائیکورٹ کی ججی سے پنشن پا کر الہ آباد چلے گئے تھے۔ احباب سے ملنے کے لئے لاہور آئے۔ اور جسٹس سید آغا حیدر صاحب کے ہاں ٹھہرے۔ جب وہ لاہور میں تھے تو میرے اور اقبال کے اُن سے بہت مراسم تھے۔ ایک دن سید آغا حیدر صاحب نے مجھے اپنے ہاں کھانے پر بُلایا۔ کھانے کے بعد اقبال کی باتیں شروع ہوئیں تو سر عبدالرؤف نے کہا کہ مَیں نے سُنا ہے کہ اقبال اپنی نظموں کو بڑے موثر انداز سے پڑھتا ہے۔ مگر افسوس کہ مَیں اِتنے برس لاہور میں رہا۔ اور اقبال سے مُلاقات بھی رہی۔ مگر مجھے ہمّت نہ ہوئی کہ مَیں فرمائش کرتا کہ اپنا کلام لَے سے پڑھ کر مجھے سُنائیں۔ آغا صاحب نے کہا کہ میں اکثر اقبال سے ملنے جاتا ہوں مگر افسوس کہ آپ ایسے وقت میں لاہور آئے۔ جب اقبال نے اپنے پڑھنے کا انداز بدل دیا ہے۔

دونو نے مجھ سے کہا کہ تم اقبال کے پُرانے دوست ہو۔ کوئی طریق بتاؤ جس سے ہم اُن کا کلام اُنکے پُرانے انداز سے سُن سکیں۔ میں نے کہا۔ کوشش کروں گا۔ گو کامیابی یقینی نہیں کہی جاسکتی۔ تجویز یہ ہوئی کہ اقبال کو اور مجھے پھر کسی دن کھانے پر بُلائیں۔ مگر کسی اور کو نہ بلائیں۔ اور کھانے کے بعد سید عبدالرؤف اقبال سے کہیں۔ اقبال اُن کا ادب کرتے ہیں۔ شاید اُن کی فرمایش کو نہ ٹالیں۔ اس قرارداد کے مطابق ہم چاروں ایک شب جمع ہوئے میں جانتا تھا کہ سید عبدالرؤف کے کہنے پر اقبال صاف انکار تو نہیں کریں گے۔ مگر غالباً یہ کہیں گے کہ مجھے اب اپنا کلام یاد نہیں رہتا۔ اور کوئی اشعار یاد بھی ہوں تو مسلسل یاد نہیں۔ اس کا علاج میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ میں گھر سے چلتے وقت اُن کی اُردو فارسی کتابیں اپنے ساتھ ایک کاغذ میں لپیٹ کر لے گیا تھا۔ تاکہ اگر یہ عذر پیش ہو تو میں کتابیں پیش کر دُوں۔ جب ہم سب کھانے سے فارغ ہوئے اور دوسرے کمرے میں جاکر بیٹھے تو سید عبدالرؤف نے بہت اچھے لفظوں میں اپنی آرزو بیان کی۔ اور کہا کہ مجھے اس لطف سے محروم نہ رکھئے جو آپ کے اور دوست پہلے اُٹھا چکے ہیں اور یہ بھی کہا کہ میں بوڑھا آدمی ہُوں معلوم نہیں پھر یہاں آؤں یا نہ آؤں۔ آپ سے یہ میری آخری درخواست ہے۔ اس کا اقبال پر اچھا اثر ہُوا۔ مگر اُنہوں نے وہی عذر پیش کیا۔ جس کی مجھے توقع تھی۔ میں اُٹھ کر وہ کتابیں لے آیا اور اُن کے سامنے رکھدیں۔ اب انہیں انکار کا راستہ نہ رہا۔ اور طبیعت بھی کچھ مائل ہوگئی۔ انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔ اُن دو نوجوں کے لئے تو اُن کی خوش نوائی ایک نئی چیز تھی۔ میں جو پہلے سُن چکا تھا۔ میرے لئے بھی ایک گئی ہُوئی نعمت واپس آئی۔ ہم اس طرح جھوم جھوم کر سُننے لگے کہ اقبال کو بھی مُدت کے بعد اس طرح پڑھنے کا مزا آگیا۔ اور اُن کی طبیعت کی وہ خصوصیت بھی اپنا رنگ لائی۔ اُن کی آنکھوں

ہیں آنسو تھے۔ اور ہم تینوں کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ پڑھتے پڑھتے اُن کے آنسو بہ نکلے۔ پھر ہم کیا پتھر تھے۔ کہ ہمارے آنسو تھمے رہتے۔ رات کے کوئی دس بجے تھے۔ جب اقبالؔ نے پڑھنا شروع کیا۔ آدھی رات ہو گئی۔ تو ہم سب کو پتہ چلا کہ اتنی دیر ہو گئی ہے۔ باولِ نخواستہ یہ پُر کیف صحبت ختم کرنی پڑی۔ دونو سید بہت ممنون ہوئے۔ اقبالؔ کو اُن کی دوستی کا بھی پاس تھا اور سیادت کا بھی۔ اقبالؔ کو بارگاہِ رسالت سے ایسی عقیدت تھی۔ کہ وہ ہر سیّد کا احترام کرتے تھے۔ جب ہم دونو وہاں سے چلے۔ تو اقبالؔ نے شکایت کی کہ تُم نے آج بری طرح مدت کا بندھا ہُوا معمول مجھ سے ترک کرایا میں نے کہا کہ سید عبدالرؤف کا دلی شوق ایسا تھا کہ انہیں محروم رکھنا ظُلم تھا۔ اگر یہ بات آپکے خلاف طبع ہوئی ہے تو مجھے معاف کریں۔ اقبالؔ نے کہا۔ میں بھی اسی خیال سے پڑھنے پر آمادہ ہو گیا مگر تمہیں اس شرط سے معافی ملتی ہے کہ کل پر یا آئندہ مجھے ایسی فرمایش نہ ہو۔ کل کی تاکید اسلئے کی۔ کہ یہ قرار پایا تھا کہ دوسرے دن شام کو دونو سیّد صاحبان نے پھر فرمایش کی۔ مجھے اُن کو بتانا پڑا کہ میرے اور اقبالؔ کے درمیان جو معاہدہ ہو چکا ہے۔ اس کا پابند ہوں اور درخواست میں شریک نہیں ہو سکتا۔

حیف کہ کچھ عرصہ بعد گلے کی بیماری کی وجہ سے اُس آواز کو صدمہ پہنچا کہ مرحوم اپنی عمر کے آخری سالوں میں معمولی بات چیت بھی بہت دھیمی آواز سے کر سکتے تھے۔ ۱۹۳۴ئہ میں جب میں لاہور سے روانہ انگلستان ہُوا تو اقبالؔ بیمار تھے۔ اسی بیماری کی وجہ سے وہ اکسفورڈ نہ آسکے۔ جہاں اُنہیں لکچر دینے کے لئے بُلایا گیا تھا۔ اسی زمانہ میں ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کو جو اُن کے خاص قدر دانوں میں تھے۔ خیال آیا کہ اُن کا معالجہ ہونا چاہیئے۔ انہیں اپنے ہاں بُلا کر مہمان رکھا اور

علاج بھی کرایا۔ جس سے قدرے افاقہ ہُوا۔ اور گفتگو میں کچھ آسانی پیدا ہو گئی۔ مگر گلا پُورا درست نہ ہو سکا۔ میں ۱۹۳۶ء میں چند ماہ کی رُخصت لیکر لاہور گیا تھا۔ غنیمت ہے کہ مرحوم سے دو آخری مُلاقاتیں نصیب ہو گئیں۔ ایک دن گیا۔ تو وہ علیل تھے اور پلنگ پر لیٹے ہُوئے تھے۔ اُن کے پاس چند نوجوان طلباء اور دو ایک دوست بیٹھے تھے۔ لیٹے لیٹے مجھے گلے لگایا۔ اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس کے چند روز بعد صحت کچھ بہتر ہُوئی تو مجھے دوپہر کے کھانے پر بُلایا اور میرے ساتھ کھانا کھایا۔ دو اور دوست بھی اس دعوت میں شریک تھے۔ اُس دن مزاج شگفتہ تھا۔ اور کئی باتوں میں پُرانے زمانے کی جھلک نظر آتی تھی۔ مگر کیا معلوم تھا کہ میں اُنہیں آخری دفعہ دیکھ رہا ہُوں۔ اور اُن کی دلچسپ باتیں آخری دفعہ سُن رہا ہوں۔

ہم "کیفِ غم" کے لئے اُن کی آواز تو اب نہیں سُن سکتے۔ مگر اُن کا کلام اس سے لبریز ہے اور اس کیف میں جوشِ زندگی ملا ہُوا ہے۔

اقبال کی یاد میں

میاں بشیر احمدؒ بی۔اے بیرسٹرایٹ لاء
ایڈیٹر ہمایوں

جب ہم کسی بڑے آدمی کی ملاقات کا ذکر کرتے ہیں اور ان باتوں کو یاد کرتے ہیں جو اس نے ہم سے اور ہم نے اس سے کہیں تو ہم اپنے دل میں ایک قسم کی خوشی لیکن ساتھ ہی اگر ہم دیانتدار ہیں تو ایک قسم کی تشویش بھی محسوس کرتے ہیں۔ خوشی کی وجہ ظاہر ہے اچھائی اور بڑائی کا ذکر دل خوش کُن ہے انسان فطرتاً انہیں پسند کرتا ہے ان کی طرف کھچا چلا جاتا ہے۔ پھر ہماری خودپسندی فخر کرتی ہے کہ بڑائی سے تعلق کی وجہ سے ہم بھی گویا بڑے ہو گئے۔ خوشی تو اس لئے ہوتی ہے۔ اور

تشویش سی کچھ اس لئے کہ بڑائی کے سامنے ہم اپنی کمزوری اور کمی محسوس کرنے لگتے ہیں لیکن زیادہ تر اس لئے کہ ہم جھجکتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو ہم روایت کرنے میں چوک جائیں۔ جو کچھ بڑے آدمی نے کہا ہم بے جانے بوجھے اس میں کچھ اپنی طرف سے بڑھا گھٹا دیں۔ اس نے کہا کچھ ہو اور ہم نے سمجھا ہو کچھ اور۔ اور اگر ہمارا حافظہ زیادہ مضبوط نہ ہو تو جھجک اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ڈاکٹر اقبال علیہ الرحمتہ کے متعلق میری بعینہٖ یہی حالت ہے۔ اس واسطے جب میرے عزیز دوست نے کہا کہ آپ ایک مضمون کی شکل میں ڈاکٹر صاحب کی بابت اپنی ذاتی معلومات بیان کیجئے تو میں نے طرح طرح کے سچے جھوٹے بہانے بنائے۔ میں نے کہا میری معلومات کچھ ایسی ویسی ہیں۔ اس سے نہیں معلوم میرا کیا مطلب تھا؟ ایک تو مضمون لکھنے پر سستی کا اظہار دوسرے شاید یہ خیال کہ اور اصحاب بہت پتے کی باتیں لکھیں گے بڑے علمی طریقے سے اقبال اور اس کے کلام کا ذکر کرینگے اور میرے لئے یہ کوشش کم از کم تکلیف دہ ہوگی۔ تیسرے یہ کہ مرحوم سے میں زیادہ تر ان کی عمر کے آخری حصے میں ملتا رہا۔ اس سے پہلے جتنا ان سے ملنا اور جتنا انکو جاننا چاہیئے تھا۔ میں نہ جانتا تھا پھر مجھے کیا حق حاصل ہے کہ میں اقبال پر ایک مقالہ قلمبند کرنے کا تہیّہ کروں اور پھر یہ کہ بہت سی باتیں جو انہوں نے مجھ سے پچھلے چند ماہ میں کیں مجھے ٹھیک یاد نہیں رہیں۔ لیکن پروفیسر حمید احمد خاں صاحب جو ایک مصمم ارادہ لئے ہوئے تھے ان پر ان دلائل اور براہین کا ذرا بھی اثر نہ ہوا اور اس کے بعد جب میں نے بے تکلفی سے ڈاکٹر صاحب سے اپنی بعض ملاقاتوں کا ذکر کیا تو ان حضرات نے مجھے دھر پکڑا کہ بس یہی بیان کر دیجئے بس یونہی لکھ بھی دیجئے۔ اس کے بعد اگر میرا مضمون مضمون نہ ہوا اگر وہ ایک مقالہ کی حد تک نہ پہنچ سکے اگر وہ

محض بات چیت سی ہو اور بہت سی اپنی ذات کے متعلق کہانیاں ہوں تو الزام بر گردنِ مرتب مگر سچ یہ ہے کہ یہ سب کچھ کہہ سن کر اب مجھے اطمینان سا ہو گیا ہے تشویش تقریباً غائب ہے اور خالص خوشی موجود۔ خوشی ہے کہ میں بھی ان ہزاروں اصحاب کے زمرے میں شریک ہوں جو شاعرِ ملّت کے متعلق کوئی ذاتی تجربہ بیان کرتے ہیں۔

ابھی تھوڑا عرصہ ہُوا جب ہمارا محبوب شاعر زندہ تھا ہندوستان بھر میں ۹ جنوری ۱۹۳۶ء کو یوم اقبال کی دھوم مچی تو لاہور میں مَیں نے بھی ایک عام اجلاس میں انگریزی میں ایک مقالہ پڑھا اور اردو میں ریڈیو پہ ایک تقریر نشر کی۔ اس کے دوسرے ہی دن میں مرحوم سے ملا اور میں نے کہا کہ شفیع صاحب نے جلسے کا خوب انتظام کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے آنکھیں جھپکیں اور میں نے دوبارہ کچھ ایسی ہی بات کہی تو ایک معنی خیز "ہوں" سے جواب دیا۔ اس پہ میں کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ ملک و قوم کو ان کے لئے اس سے بھی بہت کچھ اور کرنا چاہیئے اور کرنا چاہیئے تھا اور آئندہ بھی کرتے رہنا چاہیئے مجھے اور لاکھوں کی طرح یہ خوشی تھی کہ شکر ہے ہم نے کچھ کیا لیکن ساتھ ہی اُن کی احسانمند ہُوں نے شرمندہ کر دیا کہ کہاں یہ عظیم الشان انسان اور کہاں ہم اُسے کبھی کبھی یاد کرنے والے اس تقریب سے پہلے میں نے کبھی اقبال کے متعلق نہ کوئی مضمون لکھا تھا نہ تقریر کی تھی۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ مجھے ایک زبردست نقّاد اور ایک باقاعدہ فلسفی ہونا چاہیئے جب کہیں جا کر میں اقبال کے متعلق کچھ کہہ سکتا ہُوں مگر میں خوش ہوں کہ اس وقت ان کی وفات سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے مَیں نے کچھ لکھا اور اب پھر مجھے موقع ملتا ہے کہ کچھ لکھوں اور بے تکلفی سے لکھوں۔

اقبال کو پہلے پہل مَیں نے شیرانوالہ دروازہ کے اسلامیہ سکول میں انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں میں شاید چونتیس ۳۴ پنیتیس ۳۵ سال ہُوئے دیکھا۔ مَیں سکول میں پڑھتا تھا۔ مجھے خُوب یاد ہے۔ پہلی نظم جو مَیں نے سُنی تصویرِ درد تھی۔ ایک حسین نوجوان "ناک پکڑ" عینک لگائے شلوار اور چاندنی جوتی پہنے گریبان کا بٹن کھُلا ہُوا اسٹیج پر کھڑا خوش الحانی سے ایک مخصوص لَے میں پڑھ رہا تھا:

نہیں منّت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

میری عمر تو دس سال کی ہو گی "منت کشِ تابِ شنیدن" نے تو مجھے قطعاً مرعوب اور خاموش کر دیا گو "خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری" سے لطف آیا یہ یاد نہیں کہ اس کے صحیح معنے بھی سمجھ میں آئے کہ نہ آئے لیکن ہم نوعمروں کی ٹولی نے بھی خُوب سر ہلایا۔ اتنے میں اقبال اپنے شعر گاتے گئے ہم لحن و حن سے تو واقف نہ تھے ہم تو اسے محض گانا سمجھتے تھے اور ہم بغیر سمجھے شریکِ محفل رہے یہاں تک کہ ایک ایک شعر بِکنے لگا۔ اقبال اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر تھے ایک نوجوان نے بڑھ کر شاید پندرہ روپے میں ایک شعر خرید لیا۔ معلوم ہُوا کہ یہ اقبال کا گورنمنٹ کالج کا ایک ہندو شاگرد ہے یہ رقمیں سب انجمن حمایتِ اسلام کے چندے میں ادا ہوتی تھیں۔ یہ تھا اقبال کا دیدار پہلی بار میرے لئے۔ اسے "ملاقات" سمجھ لیجئے ہمارے لئے اس زمانے میں یہ ملاقات سے کم نہ تھا۔

اس کے بعد "آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہُوا زمانہ" یاد آتا ہے۔ یہ اقبال کی پہلی نظم تھی جو مَیں نے یاد کی اور جب "بانگِ درا" کے چھپنے پر مَیں نے اُسے بدلا ہُوا پایا تو اُسے محض تھوڑا سا پڑھ کر

فوراً حکم لگا دیا کہ نظم خراب ہو گئی ہے۔ کہاں وہ

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

اور کہاں یہ "وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا مل کے گانا" کیا ہم سب کو "بہاروں" سے "جھاڑیاں اور سب کے گاتے" سے "اپنا آشیانہ" عزیز تھا؟ کچھ بھی ہو پرانی جانی پہچانی ہوئی چیز نئی اصلاح شدہ چیز سے کہیں زیادہ مرغوب و محبوب تھی۔ کچھ عرصہ تک بانگِ درا پڑھتے رہنے کے بعد نئی چیزوں سے انس پیدا ہوا اور اکثر اصلاحیں سمجھ میں آنے لگیں۔

میرے والد جسٹس شاہدین مرحوم سے اقبالؔ کے خاص تعلقات تھے۔ میاں صاحب جب ۱۸۹۰ء میں ولایت سے بیرسٹرین کر واپس آئے اس کے بعد ایک طرف تو ان کا علیگڑھ تحریک سے خاص تعلق پیدا ہوا اور دوسری طرف وہ لاہور میں قابل نوجوانوں کے ایک دائرے کے مرکز بن گئے۔ اس دائرے میں اقبالؔ بھی شامل تھے۔ چنانچہ اپنی پہلی نظم "چمن کی سیر" میں جو مخزن میں اکتوبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی حضرت ہمایوں فرماتے ہیں:

اعجازؔ دیکھ تو سہی یہاں کیا سماں ہے آج — نیرنگِ آسمان و زمیں کا نیا ہے رنگ

اقبالؔ تیری سحر بیانی کہاں ہے آج — ناظرؔ! کمانِ فکر سے مار ایک دو خدنگ

از نغمہ ہائے دلکش ایں چارہ یارِ ما

پنجاب خوش نواست ہمایوں دیارِ ما

اور شالامار باغ کشمیر پر جو نظم لکھی اور جو مخزن میں جون ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی اس میں

فرماتے ہیں:

ناظرؔ بڑا مزہ ہو جو اقبالؔ ساتھ دے
ہر سال ہم ہوں شیخ ہو اور شالامار ہو

معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اقبالؔ اپنی عمر کے آخری حصے میں سیر و سیاحت کے مشتاق نہ تھے جوانی کے دنوں میں بھی یہی حال تھا۔

اقبالؔ نے بھی بعض اشعار میں ہمایوں کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ اس غزل کا جس کا مطلع ہے:

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لئے
بجلیاں بیتاب ہوں جن کے جلانے کے لئے

ایک غیر مطبوعہ شعر ہے:

ترک کر دی تھی غزلخوانی مگر اقبال نے
یہ غزل لکھی ہمایوں کے سُنانے کے لئے

والد بزرگوار کے کاغذات میں ایک پُرزہ نکلا جس کے ایک طرف ایک دعوت کی تقریب میں اقبالؔ نے میز کی ایک طرف سے انہیں دو شعر لکھ کر بھیجے اور جواب میں والد نے اسی زمین میں شعر لکھا۔ دو دوستوں میں خوب نوک جھونک ہُوئی۔ ان اشعار کے نقل کرنے کا یہ موقع نہیں۔

ہمایوں مرحوم پر اقبالؔ کی نظم مشہور ہے اور یقیناً ان کی بہترین نظموں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے:

اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی　　تیری چنگاری چراغِ انجمن افروز تھی

اس سے نہ صرف ظاہر ہوتا ہے کہ اقبالؔ ان سے کس قدر آشنا تھے بلکہ یہ اس زمانے کی طرف اشارہ ہے جب علمی صحبتوں میں یہ سب لوگ اکٹھے ہوتے تھے اور جب والد مرحوم نے لاہور میں پہلے پہل ایک محمڈن ینگ مین ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی تھی۔

۱۹۱۰ء میں اپنے انگلستان جانے سے پہلے کا کوئی واقع مجھے تفصیل اور صحت کے ساتھ یاد نہیں جس کا میں ذکر کرسکوں۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے گھر میں اکثر سر سیّد اور شبلی اور محسن الملک، اور حالیؔ اور اقبالؔ کا ذکر ہوتا تھا۔ اور ۱۹۰۸ء کے بعد والد نے کئی بار مجھ سے کہا کہ میں اقبالؔ کو ترغیب دینا چاہتا ہوں کہ وہ بیرسٹری ترک کرکے علی گڈھ کالج میں چلے جائیں جہاں وہ قوم کے لئے اور بھی مفید ثابت ہوں اور جیسے حالی نے مسدس لکھی اس طرح نئے حالات کے مطابق وہ اس مرکزی مقام سے قوم کو خطاب کریں۔

۱۹۱۴ء میں ولایت سے واپس آکر جب میں نے سال دو سال بیرسٹری اختیار کرنے کی کوشش کی تو لاہور چیف کورٹ کے بار رُوم میں مجھے اکثر اقبالؔ کو دیکھنے اور بعض دفعہ ان سے باتیں کرنے کا موقع ملا۔ میرے دل میں اُن کی بے حد عزّت تھی میں ان کو اتنا بڑا اور اپنے آپ کو ہر طرح اتنا چھوٹا سمجھتا تھا۔ کہ ان سے باتیں کرنے کی بھی مجھے جُرأت نہ ہوتی تھی۔ دُور ہی دُور دیکھ کر گویا اُن کی پرستش کیا کرتا۔ میرے تایا زاد بھائی میاں شاہنواز صاحب بیرسٹر اقبالؔ کے خاص دستوں میں سے تھے اور مجھے بھی معلوم تھا کہ ان لوگوں کی ایک خاص بے تکلّف صحبت ہوا کرتی تھی۔ جس میں مجھ سے نوعمر کے لئے گنجائش نہیں ہوسکتی۔ ایک روز میں بار رُوم میں گیا تو دونو دوست بیٹھے تھے۔ اقبالؔ نے مجھے دیکھ کر کہا۔ آیئے مولانا بشیر! یہ سُن کر مجھے بے حد شرم آئی۔ میں نے وہیں باتیں

دیکھا مگر کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ بھائی شاہنواز نے کہا دیکھو تم نے مخزن میں جو گمنام ایک نعت بھیجی ہے وہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو دکھادی ہے۔ مخزن انکے ہاتھ میں تھا۔ نعت کا پہلا شعر تھا یہ

بیاباں کو بنایا غیرتِ خلدِ بریں تُو نے
چمن میں کردیا ہر گل کو نکہت آفریں تُو نے

میرا دل بڑھانے کو ڈاکٹر صاحب نے بعض شعروں کی تعریف کی۔ کچھ یہ خیال ہوگا کہ آج کل کا کوئی یورپ زدہ نوجوان مذہب کا ذکر کرے تو اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔

اس کے بائیس۲۲ سال بعد پچھلی سردیوں میں جب میں ان سے اکثر ملتا رہا چند بار انہوں نے اسی مولانا سے مجھے مسکرا کر خطاب کیا دوسری تیسری دفعہ میں نے بھی مسکرا کر ذرا احتجاج کیا کہ ڈاکٹر صاحب میں کہاں کا مولانا ہوں مسکرا کر فرمانے لگے واہ مولانا کوئی بُری بات ہے اور کیا مولاناؤں کے سر پر سینگ ہوتے ہیں آخر کچھ عربی جانتے ہی ہونا؟ وغیرہ وغیرہ

والد مرحوم کی وفات کے چند سال بعد جب دسمبر ۱۹۲۱ء میں میں رسالہ ہمایوں جاری کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ تو میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک نظم کے لئے درخواست کی سن کر کہا کہ تم رسالہ کیا نکالتے ہو اُردو کے رسالے تو نکلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں تم اُردو لٹریچر کے لئے کوئی اور زیادہ مفید کام کرو میں نے پوچھا تو فرمایا کہ تم فرانسیسی زبان سے واقف ہو گارساں دتاسی کی تصانیف کو اُردو میں منتقل کردو۔ مگر میرے دماغ میں رسالے کا شوق سمایا ہوا تھا۔ نظم کے لئے میں نے اصرار کیا تو (پنجابی میں) کہا "دیکھو" ایسے تمام اصراروں اور مطالبات کے جواب میں اسی مختصر "دیکھو" سے کام لیتے تھے۔ بعد میں جب مجھے دو تین مرتبہ اسی "دیکھو" سے واسطہ پڑا تو میری خودداری

نے ذرا سمجھداری سے کام لے کر آئندہ تقاضا کرنا ہی چھوڑ دیا اور ایسا کرنا ہی مناسب تھا۔ اس کے بعد مجھے ڈاکٹر صاحب سے کبھی مایوسی نہ ہوئی۔ میں نے سمجھ لیا کہ ان کی چیزیں زبان و ادب اور قوم و ملک کے لئے ہیں محض رسالوں اخباروں والوں کے لئے نہیں۔ ہاں یہ ذکر کر دینا چاہیئے کہ پہلے "دیکھو" کے چند ہی روز بعد انہوں نے والد مرحوم پر اپنی نظم "ہمایوں" بھائی شاہنواز کے ذریعے سے مجھے ہمایوں کے پہلے نمبر میں اشاعت کے لئے بھیجی۔ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ اب تک میرے پاس موجود ہے۔ دو ایک بار اور بھی انہوں نے ہمایوں کے لئے کچھ مرحمت فرمایا۔ ہاں اس سے مجھے یاد آتا ہے کہ ۱۹۱۸ء میں والدِ مرحوم کی وفات پر انہوں نے مجھے ایک تاریخی رُباعی بھیجی جو اُن کی قبر پر کتبہ کی صورت میں کندہ ہے:

در گلستانِ دہر ہمایونِ نکتہ سنج | آمد مثالِ شبنم و چوں بوئے گل رمید

می جست عندلیبِ خوش آہنگ سالِ فوت | علامۂ فصیح ز ہر چار سو شنید

(۳۴۴ × ۴ = ۱۳۳۶)

ایک اور شعر بھی لکھا جس سے اس لگاؤ کا اظہار ہوتا ہے جو اقبال کو ہمایوں سے تھا:

دوش بر خاکِ ہمایوں بلبلے نالید و گفت

اندریں ویرانہ ما ہم آشنائے داشتیم

بعد میں کئی بار جو باتیں ان سے ہوئیں ان سے مجھ پر ثابت ہوا کہ جن چند در چند ہستیوں کی انکے دل میں بہت قدر و منزلت تھی ان میں ایک والد بزرگوار تھے۔

۱۹۲۲ء میں جب میں نے والد کے اردو کلام کو شائع کرنے کی غرض سے یکجا کیا تو کئی بار ڈاکٹر صاحب سے اُن کے انارکلی والے مکان میں جاکر مشورہ کیا۔ اس سلسلے میں جب ایک روز وہاں گرامی مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے حضرت گرامی نے مجھ سے فرمائش کی کہ آپ بھی کبھی شعر کہتے تھے کچھ سنایئے۔ میں نے

عرض کی کہ مجھے شعر کہنا نہیں آتا ایسی ہی تک بندی ہے اصرار کیا تو مَیں نے دو تین شعر سنائے۔ ایک شعر میں سچائی بروزنِ بھلائی باندھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ لفظ سچّائی ہے سچائی نہیں۔ ان کی پہلی اور آخری اصلاح تھی جو میرے نصیب میں آئی۔ مَیں نے کبھی اپنی تفریحِ طبع کو اس قابل نہ سمجھا کہ ان سے اصلاح لیتا ورنہ غالباً اس سلسلے میں بآسانی میں ان کی تضیعِ اوقات کا موجب بن سکتا۔

جیسے اقبال ۱۹۳۸ء میں اپنے سالِ وفات میں تھے ویسے ہی وہ سترہ سال پہلے ۱۹۲۱ء میں تھے۔ وہی حقہ وہی اُن کا نوکر علی بخش اسی طرح شلوار اور قمیص پہنے چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ قمیص کے گلے کا اُوپر کا بٹن کھلا ہے عموماً پنجابی میں باتیں کرتے تھے اور دُنیا بھر کی باتیں بڑے بڑے مضمون پر چھوٹی سی چھوٹی بات پر ہو رہی ہیں جو آئے آجائے جو چاہے کہے جو اُن کا خیال ہے وہ بیان کر رہے ہیں بے تکلفی سے بات چیت ہو رہی ہے۔ معلومات کا خزانہ ہے کہ سب کے لئے کھلا ہے لیکن کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ عقلمندی کے موتی بکھر رہے ہیں۔ ادھر ان کا بھی کچھ خرچ نہیں ہوتا یہ نوعِ انسان کے اور بالخصوص اپنی قوم کے شیدائی ہیں لوگ بُرے ہوں یا بھلے انہیں کیا وہ بھی انسان ہیں یہ بھی ان کا وقت اُن کا وقت ہے پھر شکایت کیسی اور رعونت کیوں؟ ایسے ہوتے ہیں بڑے آدمی! کسی قسم کا شہنشاہی یا سادھوانہ دکھلاوا بھی نہیں۔ جو ہیں سو ہیں۔ تشہیر کی ضرورت نہیں۔ خلوص کی ایک تصویر ہیں حکومت پر انگریزوں پر سیاسی لیڈروں پر نیک نیتی سے تنقید کر رہے ہیں کسی کا ڈر خوف نہیں کیونکہ کسی کی خوشامد منظور نہیں کسی کا کھائیں تو اس کا گائیں۔ کسی سے غرض نہ مطلب لیکن یوں واسطہ اور تعلق ہر کسی سے جو ملے یا ملجائے!

پہلے اپنے ایک مضمون میں لکھ چکا ہوں کہ مجھے ڈاکٹر صاحب سے دل ہی دل میں اس بات

کی شکایت تھی کہ انہوں نے فارسی میں کیوں لکھنا شروع کیا چنانچہ میں نے ایک بار سے زیادہ ان سے اپنی شکایت کا اظہار کیا اور پنجابی کا مشہور فقرہ دہرایا کہ "فارسیاں گھر گالے" (یعنی فارسی نے گھر تباہ کردئے پنجاب میں مشہور ہے کہ ایک جُلاہے نے اتنی فارسی پڑھ لی کہ اپنے گھر لوٹ کر پھر وہ پنجابی میں بات ہی نہ کر سکتا تھا چنانچہ وہ آب آب کرتے ہی مرگیا اور کسی نے نہ سمجھا کہ بے چارہ پیاسا ہے) اس پر ہمیشہ مسکرا دیتے۔ میں نے اصرار کیا تو کہا کہ میری اُردو بھی تو نری فارسی ہے میں نے کہا نہیں پھر بھی اُردو میں لکھیئے۔ لے دے کر ایک آپ ہمارے پاس ہیں وہ بھی فارسی میں لکھنے لگے تو نتیجہ کیا ہوگا۔ فرمایا کہ شاعر کا خیال جس زبان میں بھی موزوں ہو جائے وہ اسی میں کہے گا۔ مجھے ان کی فارسی سے اتنی چڑ تھی کہ میں نے کئی سال تک یہ کہہ کر کہ . . . فارسی زیادہ سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ ان کی فارسی مثنویاں نہ پڑھیں آخر ایک روز اٹھا کر دیکھیں اور پڑھیں دل میں ایک حرکت سی پیدا ہوئی تو اپنے آپ کو بُرا بھلا کہا۔ کہ حیف ہے میں اتنی مدت اس دولت سے محروم رہا۔

ایک روز کا واقعہ یاد آتا ہے کہ چیف کورٹ کے سامنے سڑک پر میں ڈاکٹر صاحب سے باتیں کرنے لگا۔ دورانِ گفتگو میں میں نے دورِ حاضر کی اشتہاریت کی شکایت اور مذمت کی۔ فرمانے لگے خدا کی طرف دیکھو وہ سب سے بڑا پراپیگنڈا کرنے والا ہے۔ یہ کائنات ساری کی ساری اسی کا پراپیگنڈا نہیں تو اور کیا ہے ہزاروں لاکھوں بے شمار مظاہر ہیں مظاہرے ہیں پھر مسکرا کر کہا تم پراپیگنڈا کو اتنا بُرا نہ سمجھا کرو۔

ایک اور روز میں نے ٹیگور کا ذکر کیا تو فرمایا کہ دیکھو ٹیگور عملی آدمی ہے اور اس کی شاعری امن وخاموشی کا پیغام دیتی ہے ادھر میری شاعری میں جدوجہد کا ذکر ہے۔ لیکن میں عملی آدمی

نہیں ہوں۔

بالِ جبریل چھپی تو میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ میں کلکتے میں تھا وہیں منگوائی وہاں سے بہرائچ کے جنگلوں میں گیا تو ساتھ لے گیا اور مزے لے لے کر پڑھی اپنے آپ کو کوسا اور کہا کہ اتنا بڑا آدمی اور ایسا شاعر تمہارے ہی شہر میں دن رات رہنے والا اور تمہاری یہ حالت ہے کہ اس کے پاس گئے بھی تو محض کبھی کبھی۔ حیف ہے تُم پر۔ غرض لوٹ کر دُوسرے تیسرے دن ہی اُن کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ بالِ جبریل کی بہت تعریف کی اور شکر کا اظہار کیا کہ وہ فارسی سے پھر اُردو کی طرف آئے۔

اُن دنوں میں مَیں اپنی غذا کا ایک عجیب و غریب تجربہ کر رہا تھا۔ گوشت مچھلی انڈا۔ چینی گھی مکھن دُودھ سوپ شوربہ بادام اخروٹ بلکہ آلو گوبھی تک سب کچھ چھوڑ کر چند بھاپ زدہ ترکاریوں اور چکّی کے آٹے پر گُذران کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ میں نے سادہ اور صحت بخش زندگی کا راز پا لیا یہ خبط اپنی انتہائی شکل میں دو سال تک میرے سر پر سوار رہا۔ یہی دن تھے کہ مَیں نے بالِ جبریل پڑھی۔ ڈاکٹر صاحب سے جو اور عقیدت پیدا ہُوئی تو اس کا اظہار اس طرح کرنا چاہا کہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر جب معلوم ہُوا کہ اُن کی صحت خراب ہو رہی ہے گلا بیٹھ گیا ہے آواز ذرا ذرا سی باقی ہے تو مَیں نے ترکاری نوشی پر ایک طُول طویل لکچر دینا شروع کیا اور عرض کی کہ ایک تو باغ کی سیر کیا کیجئے اور دوسرے ترکاریاں کھا کر آزمائیے۔ پہلے تو کہا کہ بعض مسلمان اطباء نے بھی ان کی خوبیاں اور خواص بیان کئے ہیں مَیں نے اصرار کیا تو مسکرا کر فرمایا کہ "دیکھو"

جب وہ اپنی میورروڈ والی کوٹھی جاوید منزل میں آچکے تھے میں کبھی کبھی حاضر ہوتا۔ اور بالِ جبریل کے بعض اشعار کا مفہوم دریافت کرتا۔ ایک روز میں نے پُوچھا کہ ڈاکٹر صاحب اس شعر

میں کیا اشارہ ہے ؟

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

میں حیران ہوا کہ تین سو سال ہوئے کہ جہانگیر کے ہاں میخواری کا دور دورہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کیا پھر وہی رسم قدیم جاری کرنا چاہتے ہیں کیا؟ جواب دیا کہ نہیں یہ شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہندی کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمان ہند کے سب سے زبردست رہنما گزرے ہیں۔

ایک روز میں نے عرض کی کہ ایک نقاد دوست نے آپکے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے کہ لفظ "مینا" مؤنث نہیں مذکر ہے مجھے بھی اس اعتراض پر تعجب ہوا کیونکہ مینا شکل صورت سے اور آواز سے مؤنث معلوم ہوتا ہے علی بخش ملازم سے کہا کہ رسالہ تذکیر و تانیث لاؤ۔ دیکھا اور کہا ہاں ایسی غلطیاں مجھ سے ہو جاتی ہیں۔

برسوں تک ان سے محض کبھی کبھی ملاقات ہوئی لیکن گذشتہ سال اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ وہ پنجاب لیگ کے صدر تھے اکثر ان سے سیاسی معاملات پر گفتگو رہتی کئی بار میں نے مسلم قوم اور اردو زبان کے مستقبل کی بحث چھیڑی اردو زبان کے متعلق میں نے گاندھی جی کے مخالفانہ رویہ کی شکایت کی اور کہا کہ تعجب ہے کہ قومیت اور ہندوستانیت کا نام لیکر ہماری کلچر اور مشترکہ زبان کو یوں ملیامیٹ کیا جا رہا ہے۔ ایک دن میں ذرا جوش میں آ گیا اور پھر مایوسی کا اظہار کرنے کو تھا کہ مسکرا کر فرمانے لگے کہ ڈرو مت تمہاری قوم اور زبان اس طرح مٹائے سے مٹیں گی نہیں !

ہر ہفتے بعض دفعہ ہر دوسرے روز کئی کئی گھنٹے تک ان سے آخری سردیوں میں میری باتیں ہوئیں سیاست فلسفہ ادب شاعری یورپ کی موجودہ حالت ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل صحت اور پرہیز اور علاج اور قوتِ ارادی اور کئی اور بڑی بڑی اور معمولی معمولی چیزوں کا ذکر خدا جانے کتنے موضوع تھے۔ جن پر اس شمعِ ہدایت نے روشنی ڈالی۔ اس شک و شبہ اور بے اطمینانی کے زمانے میں میری طرح بیسیوں اوروں کو بھی احساس تھا کہ چلئے ڈاکٹر صاحب کے پاس کہ کچھ معلومات میں اضافہ ہو اور کچھ ڈھارس بندھ جائے کئی اوروں کے مقابل میں میرا ان سے کوئی خاص قریبی تعلق نہ تھا پھر بھی کم از کم گذشتہ سردیوں میں میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ میرے دل کی تنہائیوں کا سہارا ہیں اور ان کے جانے سے ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جسے پُر کرنے والا کوئی نہیں۔

مارچ ۱۹۳۸ء میں ایک روز میں عشا کے وقت کوٹھی پر گیا تو علی بخش نے مجھے روکا۔ یہ پہلی بار تھی کہ اس بھلے مانس نے مجھے روکا ہو۔ کہنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے۔ دمہ کا دورہ سخت پڑتا ہے اور ڈاکٹروں نے منع کر دیا ہے کہ وہ کسی سے بات کرنے نہ پائیں یہ سُن کر مجھے بے چینی ہوئی اور میں نے وعدہ کیا کہ میں بات چیت نہیں کرونگا۔ میں اندر گیا تو چارپائی پر اوندھے مُنہ لیٹے ہوئے تھے وہی یومِ اقبال والے شفیع صاحب بیٹھے مل رہے تھے۔ پوچھا کون ہیں؟ میں نے جواب دیا۔ فرمایا بیٹھ جائیے۔ میں نے عرض کیا براہِ کرم آپ نہ بولئے آپ کو تکلیف ہو گی۔ میں نے چند باتیں کیں اور چپ ہو کر بیٹھ رہا۔ ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر کے بعد میں کہہ دیتے "اچھا" "ہوں" "کھئے" آخر آدھ گھنٹے کے بعد میں نے معذرت چاہی۔ فرمایا آپ کو خواہ مخواہ تکلیف ہوئی۔ دل بھر آیا کہ اس سخت تکلیف کے عالم میں بھی کس طرح دلجوئی کرتے ہیں۔

اس زمانے میں ان کی صحت بہت بگڑ چکی تھی۔ لیکن ہمت و حوصلہ ایسا تھا کہ چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی اور طبیعت میں وہی خلوص اور دوستوں کے لئے وہی اُلفت کا اظہار اور ہر آنے والے کا اسی طرح خیر مقدم۔ سُبحان اللہ۔ کیا عظیم الشان انسان تھا۔ جس کی لوگوں نے بہت قدر کی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ پھر بھی پُوری قدر نہ کی۔ شاید پُوری قدر ہو ہی نہ سکتی تھی۔

ایک روز میں نے کہا کہ افسوس ہے قوم نے آپ کی پُوری قدر نہ کی۔ بانگِ درا یا دوسری کتابیں لاکھوں کی تعداد میں بِک جاتیں! میرے دوسرے فقرے کو انہوں نے پسند نہ کیا کہا کہ قوم غریب ہے اور ناقدری کا جواب یہ دیا کہ جب کوئی غریب آدمی شہر سے آکر میری مٹھی چاپی کرتا ہے تو میں سمجھتا ہُوں کہ ساری دُنیا میری قدر کر رہی ہے۔

ایک روز میں نے بعض سیاسی لیڈروں کا ذکر کیا۔ جوش میں آکر فرمانے لگے کہ یہ لوگ سب خود غرض ہیں اور ایثار نہیں کر سکتے۔ لیڈر امیروں کی جماعت میں موجود ہیں ہی نہیں۔ مُسلمانوں کے لیڈر عوام میں سے پیدا ہونگے۔ تم دیکھ لینا ایسا ہو کر رہے گا پھر وہ لوگ رہنمائی کر سکیں گے۔

ایک دفعہ اُن کی شاعری کے پیغام اور اسرارِ خودی، رموزِ بیخودی، پیامِ مشرق وغیرہ کا ذکر آگیا تو انگریزی میں کہا۔

There is a crust at the Heart of central Asia
I want to break throngh it

(وسطِ ایشیا کے قلب پر ایک پپڑی جمی ہُوئی ہے۔ مَیں اُسکے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہُوں) ایسے ہی اور بیسیوں لاجواب فقرے روزان کے مُنہ سے نکلتے۔ کاش کوئی قلمبند کرنے والا ہوتا۔

غرض سینکڑوں باتیں ہُوئیں لیکن افسوس کہ حافظہ قوی نہ ہونے کی وجہ سے میں انہیں دماغ میں

محفوظ نہیں رکھ سکا۔ اور نہیں چاہتا کہ کوئی ایسی بات لکھوں جو پوری پوری درست نہ ہو اگر کبھی اور باتیں یاد آئیں اور موقع ملا تو چند اور واقعات بھی قلمبند کر کے اپنا فرض ادا کرونگا۔ اور اس سے مزید لطف اُٹھا سکوں گا۔ آخر میں مَیں یہ کہنا چاہتا ہُوں کہ گو بدقسمتی سے یہ مصرع بار بار دُہرایا جا چکا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ غالبؔ۔ اقبالؔ اور ایسے ہی چند اور افراد پر یہ بات صادق آتی ہے کہ ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

خُدا نے اقبالؔ کو بادشاہی مسجد لاہور میں ابدی راحت کے لئے وہ جگہ بخشی جس کا وہ مستحق تھا قوم کا سچا رہنما قوم کی پاکیزہ ترین زمین میں محوِ خواب ہے۔ ہر ماہ ہزاروں ہر سال لاکھوں شخص اس کی قبر کی زیارت کریں گے فاتحہ پڑھیں گے اور اسے یاد کریں گے اور لاکھوں کروڑوں انسان اس کا پیغام پڑھیں گے یا سُنیں گے۔ وہ کچھ سمجھیں گے کچھ نہ سمجھیں گے لیکن ان کی تاریک زندگیوں میں نُور کی یہ شعاع اپنا زبردست پرتو ڈالے گی اور اُن کی مِس خاک کندن بن کر چمکے گی ؎

علّامہ اقبالؒ کی صحبت میں

محمد حسین عرشی

جس طرح مرشد رُوم نے جاوید نامہ کے "زندہ رُود"[1] کو عالمِ افلاک و ماورائے افلاک کی سیر کرائی اسی طرح اُنہوں نے مجھ کو "زندہ رُود" کی لاہُوتی مجلس میں پہنچایا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جاوید نامہ اور بالِ جبریل کے مطالعہ نے مجھے مجبُور کر دیا کہ مثنوی رُومی کو باقاعدہ بہ نظرِ تعمّق دیکھوں۔ تقریباً ۱۰ دن میں مَیں نے نصف سے زیادہ مثنوی اس طرح دیکھ ڈالی کہ ایک شعر سے بھی سرسری عبور نہیں کیا۔ ہر لفظ پر غور کرتا اور ہر ترکیب سے لذت یاب ہوتا ہُوا گذر گیا، لیکن اس دوران میں بہت سے مقام ایسے آئے، جہاں میں اپنے آپ کو تنہا محسُوس کرتا اور ایک رفیقِ راہ کی طلب میں بے چین ہو جاتا۔ بعض اوقات پیرِ رُوم خود فرما دیتے:

[1] علامہ کا نام ہے جو جاوید نامہ کی سیر سماوی میں رکھا گیا۔

یار باید راہ را تنہا مرو | از سرِ خود اندریں صحرا مرو
کے تراشد تیغ دستہ خویش را | رو بجرّاحے سپار ایں ریش را

وغیرہ ——

ایسی حالت میں، مَیں نے اپنے گرد و پیش نگاہ ڈالی، تو مجھے علامہ مرحوم کے سوا کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا، جو راہ کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتا، چنانچہ میں نے امرت سر پہنچ کر پہلا کام یہ کیا کہ علامہ مرحوم کو ایک مکتوب کے ذریعے اپنے مافی الضمیر اور اپنی مشکلات سے آگاہ کیا علّامہ نے حسبِ عادت بہت جلدی تسلی بخش جواب دیا، جسے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :

لاہور۔ ۱۹؍ مارچ ۱۹۳۵ء

جناب عرشی صاحب!

السلام علیکم۔ آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ میری صحتِ عامہ تو بہت بہتر ہو گئی ہے مگر آواز پر ابھی خاطر خواہ اثر نہیں ہُوا۔ علاج برقی ایک سال تک جاری رہے گا۔ دو ماہ کے وقفے کے بعد پھر بھوپال جانا ہوگا۔

آپ اسلام اور اُس کے حقائق کے لذّت آشنا ہیں۔ مثنوی رومی کے پڑھنے سے اگر قلب میں گرمیٔ شوق پیدا ہو جائے تو اور کیا چاہیئے؟ شوق خود مُرشد ہے۔ میں ایک مدّت سے مطالعۂ کتب ترک کر چکا ہوں۔ اگر کبھی کچھ پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومی۔ افسوس ہے، ہم اچھے زمانے میں پیدا نہ ہُوئے ؎ (مثنوی)

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں | ایک بھی صاحبِ سرُور نہیں

بہرحال قرآن اور مثنوی کا مطالعہ جاری رکھیے۔ مجھ سے بھی کبھی کبھی ملتے رہیے،
اِس واسطے نہیں کہ مَیں آپ کو کچھ سکھا سکتا ہُوں، بلکہ اس واسطے کہ ایک ہی قسم کا
شوق رکھنے والوں کی صحبت بعض دفعہ ایسے نتائج پیدا کر جاتی ہے، جو کسی کے خواب و
خیال میں بھی نہیں ہوتے۔ یہ بات زندگی کے پوشیدہ اسرار میں سے ہے،
جن کو جاننے والے مسلمانانِ ہند کی بدنصیبی سے اب اس ملک میں پیدا نہیں ہوتے
زیادہ کیا عرض کروں ؟

محمد اقبال

اِس کے بعد میں برابر حاضرِ خدمت ہوتا رہا۔ میرے اُن کے مکالمات کا غالب حصّہ باریک روحانی، متصوفانہ اور قرآنی مسائل سے متعلق ہوتا۔ مَیں عموماً سوالات کی ایک فہرست تیار کر کے لے جاتا۔ آپ ہر سوال کے جواب میں کافی گفتگو فرماتے۔ جب تک میری تسلی نہ ہو جاتی، یہ سلسلہ جاری رہتا۔ اس ضمن میں بہت سے نکات و اسرار میرے سوال و مطلب سے بھی زائد آپ کی زبان پر آجاتے۔ مَیں محسوس کرتا ہُوں کہ اگر اُن کی زبان سے نِکلے ہُوئے تمام کلمات جمع کئے جا سکتے، تو ہر روز ایک مبسوط کتاب بن جایا کرتی، جو بہت سے دینی سیاسی، تاریخی، اخلاقی، حکمی وغیرہ مباحث کا بے نظیر ذخیرہ ہوتی، لیکن اس باب میں مَیں نے خود ناقابلِ تلافی تساہل سے کام لیا کہ اُس دولت کو محفوظ نہ رکھا، جس سے میرے قلب و رُوح کی جیب معمور ہوتی تھی اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس خزانۂ عشق و عرفان کے دروازے اِتنی جلدی بند ہو جائیں گے۔ بہرحال اس سُونے دماغ میں جو کچھ بچ رہا ہے، بغیر کسی نظم و ترتیب کے قرطاس و قلم کے سُپرد کرتا ہوں کہ مرورِ وقت کی غارت گری سے محفوظ رہ سکے :

تعجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری
فروغِ صبح پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں (اقبالؔ)

ایک دفعہ مجھے لاہور کے احباب کی ایک مجلس میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ صاحب خانہ سے رخصت چاہی، تو انھوں نے کچھ دیر اور بیٹھنے کے لئے اصرار کیا۔ میں نے کہا، علامہ اقبالؔ کی خدمت میں حاضری میرے پروگرام کا اہم جزو ہے۔ اس وقت میں یہی ارادہ رکھتا ہوں۔ اس پر حاضرین نے علامہ کے جمود و تعطل پر متعصبانہ اعتراض شروع کر دیئے۔ میں اپنے ارادے پر مُصر رہا۔ آخر ان میں سے ایک بزرگ، محترم حکیم طالب علی صاحب جو اس سے پہلے علامہ سے متعارف نہیں تھے۔ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ وہاں پہنچنے پر علی بخش نے میرے حاضر ہونے کی اطلاع دی۔ میں حکیم صاحب موصوف کی معیّت میں اندر پہنچا، تو تنہا بیٹھے تھے۔ خیریت پرسی کے بعد گفتگو شروع ہوئی۔ حکیم طالب علی صاحب نے سورۂ النجم کے پہلے رکوع کی تشریح دریافت کی۔ علامہ نے اس پر ایک طویل تقریر فرمائی۔ بالخصوص کَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی کی تفسیر اپنے رنگ میں عجیب و نادر چیز تھی۔ ان سطور کے ناظرین کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آیات مذکورہ قرآن مجید کے مشکل ترین مقامات سے ہیں۔ یہاں بڑے بڑے ائمہ مفسرین نہایت دور از کار تاویلوں میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں، یہاں تک کہ ایک غیر مسلم یورپین مترجم قرآن نے اس مقام کو پیغمبرِ اسلام صلعم کے بعد کسی اور شخص کی تصنیف قرار دے دیا۔ علامہ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ناسوت و لاہوت یا عقل و وحی یا عالم بشریت و عرش الوہیت کو دو کمان نما دائروں سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ بشری عقل کا منتہائے کمال یہ ہے کہ وحی سماوی سے کامل مطابقت حاصل کرے، یعنی، اُس ترقی یافتہ عقل کے رباب سے بعض خاص اوقات میں جو نغمہ نکلتا ہے، وہ

سازِ الہام سے ہم آہنگ ہوتا ہے اس طرح یہ دو کمان کامل اتصال کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ نوعِ انسان میں انبیاء بالعموم اور انبیاء میں حضرت خاتم النّبیّین بالخصوص اس مقام کے آخری نقطہ سے واصل ہوئے۔ اس کے بعد علامہ نے فرمایا کہ اس تقریر سے یہ شُبہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ قرآن (معاذ اللہ) محمد صلعم کی تصنیف ہے۔ وحی الٰہی میں فہم بشری کا قطعاً دخل نہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ جرمنی میں ہمارے ایک پروفیسر علم ریاضی کے بہت زیادہ مشّاق تھے۔ بعض اوقات طلبہ اُن سے نہایت مشکل سوال کر بیٹھتے۔ آپ فوراً جواب بتا دیتے۔ طلباء تشریح پُوچھتے، تو کہتے، اس کے لئے دو ہفتہ کی مہلت درکار ہے۔ اُن کے نزدیک جواب دینا آسان تھا، لیکن اس کا عمل سمجھانا دیرطلب تھا۔ اسی طرح عقل و وحی کا تطابق ہر فن کے اہلِ کمال میں پایا جاتا ہے۔

میں نے عرض کیا، میرے خیال میں سرمد نے ایک شعر میں معراج کی جو حقیقت بیان کر دی ہے بڑے بڑے علماء کی مبسوط تصانیف اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ فرماتے ہیں:

مُلّا گوید احمد بہ فلک بر شد

سرمد گوید فلک با احمد در شد

علّامہ نے فرمایا، یہ شعر رُومی کے ایک شعر سے مستفاد ہے، جس کا واقعہ مثنوی میں اس طرح بیان ہُوا ہے:

کہ حلیمہ سعدیہ جب آنحضرت کی رضاعت سے فارغ ہوئیں، تو آپ کو لیکہ عازمِ مکہ ہوئیں۔ حرم میں پہنچیں، تو ایک غیبی آواز سُنی کہ اے حطیم! آج تجھے بے اندازہ شرف حاصل ہونے والا ہے الخ۔ حلیمہ اس آواز کی طرف متوجہ ہوئیں، حضورؐ کو زمین

پر بٹھا دیا اور صاحبِ آواز کا سُراغ لگانے کے لئے اِدھر اُدھر دوڑنے لگیں۔ جب کامیاب نہ ہوئیں، تو واپس آکر حضورؐ کو نہ پایا۔ سخت متحیر و مغموم ہوئیں۔ اِتنے میں ایک پیرِ مرد نمودار ہوا۔ اُس نے پُوچھا، اے حلیمہ! اس فریاد و ماتم کا سبب کیا ہے؟ جواب دیا: مَیں احمد (صلعم) کی دُودھ ماں ہُوں۔ حطیم میں پہنچ کر مَیں ہوائی آوازوں کی تلاش میں بچے کو زمین پر بٹھا کر اِدھر اُدھر پھرنے لگی۔ آواز ختم نہ ہوتی اور آواز دینے والا نظر نہ آتا تھا۔ مَیں ابھی عالمِ حیرت میں واپس آئی، تو بچے کو اس مقام پر نہ دیکھا پیرِ مرد نے کہا: غم نہ کر! مَیں تجھے ایسے سُلطان تک پہنچا دُوں گا، جو تجھے بچے کے حالِ مقام سے آگاہ کر دے گا۔ یہ کہہ کر وہ پیر، حلیمہ کو عزّیٰ کے پاس لے گیا کہ یہ بت اخبار غیبی کا ماہر ہے۔ ہم نے ہزاروں گم شدہ اس سے حاصل کئے ہیں۔ پیرِ مرد نے عزّیٰ کو سجدہ کیا اور اس کی ثناء کے بعد مناجات شروع کی کہ حلیمہ سعدیہ کا بچّہ گُم ہو گیا ہے، اس بچے کا نام محمدؐ ہے۔ جب اُس کے مُنہ سے محمدؐ نکلا، تو سب بُت سجدہ میں گِر پڑے اور پکارے کہ اَے مردِ پیر! جا ہمیں اس سے زیادہ نہ جلا۔ بُتوں کی یہ باتیں سُن کر پیرِ مرد کے ہاتھ سے عصا گر پڑا اور اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ حلیمہ نے کہا: اے مردِ پیر!

حیرت اندر حیرتم!

کبھی مجھ سے ہوا باتیں کرتی ہے، کبھی پتھر خطاب کرتے ہیں۔ آخر میرا بچہ گیا کہاں؟ پیرِ مرد نے کہا: اے حلیمہ! خوش ہو، سجدۂ شکر ادا کر!

تو مخور غم کہ نگرد دیاوہ او
بلکہ عالم یاوہ گردد اندرو[1]

یہاں پہنچ کر حضرتِ علّامہ دھاڑھیں مار کر رونے لگے، جب ذرا افاقہ ہُوا تو مَیں نے عرض کیا: یہاں "یاوہ" کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا: یاوہ گشتن، یعنی گم شدن ـــ سرمد کا شعر اسی شعر سے ماخوذ ہے!

ایک ملاقات کے دوران میں، مَیں نے عرض کیا: آپ کے مدراس والے لیکچر بعید مشکل ہیں۔ اگر اسلام یا قرآن کا منشا وہی ہے، جو آپ نے ان لیکچروں میں بیان فرمایا ہے اور جس کو اِس ترقی یافتہ زمانے کے بڑے بڑے اہل علم سمجھنے سے قاصر ہیں، تو قرن اوّل کے عرب صحرانشینوں نے اسے کیا سمجھا ہوگا؟

آپ نے فرمایا: "بُنِیَ الاسلام عَلیَ الخَمس، کسی قوم کی تشکیل و تعمیر کے لئے اسلام کے پانچ ارکانِ مشہورہ کا اجرا و انضباط کافی ہے، چنانچہ اِس کی محسُوس اور عملی صُورت عہدِ سعادت سے بہتر کہیں نظر نہیں آسکتی اور تاریخ کا حافظہ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا"

مَیں نے کہا: ایک طرف تو "یسّرنا القراٰن للذکر" فرمایا اور اسی قسم کے دوسرے ارشادات فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ اور فصّلنٰہ علیٰ علم وغیرہ بھی موجُود ہیں۔ دوسری طرف بہت سی آیات کو متشابہات کہہ کر اُن کے فہم پر لایعلم تاویلہٗ الا اللّٰہ والراسخون فی العلم کی مُہر لگادی۔ ظاہری نگاہ اس میں تضاد دیکھتی ہے"۔

آپ نے فرمایا: اس کو یُوں سمجھو ـــ ایک دفعہ لنڈن میں ایک صاحب نے کسی

---

[1] مولانا رومیؒ روایات کے ضعف و قوت سے تعرض نہیں کرتے، اُن سے عجیب و غریب نتائج اخذ کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں منہ

مہمان کے اعزاز میں چند دوستوں کو ضیافت پر مدعو کیا۔ اُن میں مَیں بھی شامل تھا۔ فراغتِ طعام کے بعد مہمانِ عزیز سے تفصیلی تعارف کرایا گیا تو معلوم ہُوا کہ آپ ماہرِ حجریات ہیں۔ مَیں نے آپ سے دوبارہ ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ فیصلہ ہُوا کہ سیر کو اکھٹے چلیں گے، چنانچہ سیر کرتے ہُوئے ہم سمندر کے ساحل پر پہنچ گئے۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ اپنے مضمون (حجریات) کے متعلق کچھ فرمائیں۔ اُنہوں نے ساحل سے ایک چھوٹا سا سنگ پارہ اُٹھا لیا اور اُس کی سوانح عمری بیان کرنا شروع کر دی۔ مختصر یہ کہ ہم ۱۵ دن روزانہ سیر کو جاتے رہے اور وہ اس پارہ حجر کے رموز و اسرار بیان کرتے رہے۔ اس کے مدارج نشو و ارتقا، ہر درجے کے زمانے کی تعیین، اس کے اجزائے اولیہ، رنگ و صلابت و صورتِ نوعیہ وغیرہ کے تفصیلی اسباب، تاثیرات و خواص وغیرہ اتنی باتیں بیان کر دیں، جو میرے لئے اور اس علم سے ہر ناواقف شخص کے لئے پردۂ خفا میں تھیں یا متشابہ تھیں اور اُس شخص کے لئے کہ راسخ فی العلم تھا، مفصّل و مبیّن تھیں، اسی طرح قرآن مجید سارے کا سارا مفصّل بھی ہے اور متشابہ بھی۔ جس قدر انسان کا ذوق و وجدان اور اخلاق و رُوحانیت ترقی کرتے جائیں گے، اُس پر قرآن کے مطالب آشکارا ہوتے جائیں گے"

اسی طرح کا ایک دُوسرا واقعہ آپ نے ارشاد فرمایا "ایک دعوت میں ہمیں ایک صاحب سے تعارف کا اتفاق ہُوا، جو صرف سطحِ بحر کی مخلوقات کے پروفیسر تھے۔ اُنہوں نے اپنے فن سے متعلق عجیب و غریب انکشافات فرمائے۔ اُن کی زبانی معلوم ہُوا کہ سمندر کی سطح پر رہنے والے جانداروں کی انواع و اقسام اور ان کے احوال و کوائف بے حد دلچسپ اور اہم ہیں، مجھ پر اُن کی تقریر سے سحر ہو رہا تھا اسی طرح ہر شخص اپنے فن کا راسخ ہوتا ہے اور وہ فن اُس کے لئے "یَسَّرْنَا" اور "فُصِّلَتْ" کے

مترادف ہو جاتا ہے"

میرے نزدیک علامہ کی تشریح "یَهْدِیْ إِلَیْهِ مَنْ أَنَابَ" کے مفہوم سے بھی کامل مطابقت رکھتی ہے۔

آخری عمر میں قریباً ہر صحبت میں مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کا ذکر آجاتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ سُلطان ٹیپو کے جہادِ حریت سے انگریز نے اندازہ کیا کہ مسئلہ جہاد اُس کی حکومت کے لئے ایک مستقبل خطرہ ہے۔ جب تک شریعت اسلامیہ سے اس مسئلہ کو خارج نہ کیا جائے، انگریز کا مستقبل مطمئن نہیں؛ چنانچہ اسی زمانہ سے مختلف ممالک کے علماء کو آلہ کار بنانا شروع کیا۔ ہندوستانی علماء سے بھی ایسے فتاویٰ حاصل کئے، لیکن ایک منصوص قرآنی مسئلہ کو مٹانے کے لئے علماء کو ناکافی سمجھ کر ایک جدید نبوت کی ضرورت محسوس ہوئی، جس کا بنیادی مسئلہ یہی ہو کہ اقوام اسلامیہ میں نسخِ جہاد کی تبلیغ کی جائے۔ احمدیت کے اسبابِ وجود پر آج تک جو کچھ لکھا گیا، اس کی وقعت سطحیت سے زیادہ نہیں۔ اس کا حقیقی سبب اسی ضرورت کا احساس تھا"

اس کے بعد علامہ نے مجھے خاص طور پر کہا "تم ایسے فتاویٰ کی نقول تلاش کرو، ممکن ہے کہ مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری سے اس کا کچھ سُراغ نکلے"۔ میں نے امرتسر پہنچ کر مولوی صاحب موصوف سے دریافت کیا، تو انہوں نے سر سید مرحوم کے کتب خانہ علی گڑھ کی طرف رہنمائی کی۔ میں نے علامہ کو اس مطلب کا ایک خط لکھ دیا۔ پھر معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ نے اس بارہ میں کوئی قدم اُٹھایا یا نہیں۔ ایک دفعہ میری موجودگی میں آپ نے سید ریاست علی صاحب ندوی کو بھی اس کام کیلئے آمادہ کیا تھا۔ اصل یہ ہے کہ یہ کام اسی وقت کرنے کا ہے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا، ہم اسکی سہولتوں

سے دُور ہوتے جائیں گے اور اس "ملتِ جدیدہ" پر تقدّس کے غلاف چڑھتے جائیں گے۔

علامہ کے برادر اکبر احمدیت سے دلچسپی رکھتے تھے۔ علامہ ان کا ادب ملحوظ رکھتے اور اس بارہ میں اُن سے گفت و گو کرنے سے اجتناب فرماتے تھے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ میری موجودگی میں احمدیت پر گفتگو ہو رہی تھی، وہ درمیان میں آگئے تو علامہ خاموش ہو گئے۔ عمر کے آخری برسوں میں جب اُنہوں نے کھُلم کھلا اِس مذہب کی تردید شروع کی، تو برادرِ بزرگ کو ناگوار گذرا۔ فرماتے تھے "ایک دن جوش میں آکر اُنہوں نے میرے ساتھ بحث شروع کر دی۔ بات یہاں تک پہنچی کہ حدیث علی راس کل مائۃ کا اقتضا یہ ہے کہ ہر صدی کے شروع میں ایک مجدد مبعوث ہو۔ تمام گذشتہ صدیوں کے مجدّد تو پائے جاتے ہیں، اِس صدی کے مجدّد اگر مرزا صاحب نہیں، تو کون ہے؟ میں نے کہا، یہ حدیث موضوع ہے۔ کہنے لگے، تم یہ نئی بات کر رہے ہو، جو آج تک نہیں سُنی گئی۔" میں نے اُسی وقت موضوعات [1]... منگوائی اور اس میں تلاش کر کے دکھلا دی۔ بھائی صاحب خاموش ہو کر رہ گئے۔"

بہت سے مولوی جو تحریکِ احمدیت کے مخالف ہیں، انہوں نے اِس مخالفت کو ذریعہ معاش بنا رکھا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ احمدیت مِٹے، کیونکہ اس کے مٹنے سے اُن کی تجارت مٹ جائے گی۔ لیکن علامہ مرحوم اُن لوگوں سے تھے جو پورے خلوص اور کامل بصیرت سے اس فرقہ کو تمام عالم اسلامی، عقایدِ اسلامی، شرافتِ انبیاء، خاتمیت محمد صلعم اور کاملیت قرآن کے لئے قطعاً مُضر و منافی سمجھتے ہیں وہ فرماتے تھے کہ:

> "قرآن کے بعد نبوت و وحی کا دعویٰ تمام انبیائے کرام کی توہین ہے یہ ایک ایسا جرم ہے۔ جو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ ختمیت کی دیوار میں سوراخ کرنا تمام نظام دیانت کو درہم و

[1] نام یاد نہیں رہا۔ منہ

برہم کر دینے کے مترادف ہے"۔

(یہ تحریر جو حافظہ کی مدد سے لکھی گئی ہے، یہاں تک پہنچ چکی، تو مجھے ایک کاپی دستیاب ہوئی۔ جس میں کچھ اشارات میرے قلم سے لکھے ہوئے مل گئے۔ ذیل میں اُنکی مدد سے لکھتا ہوں۔ راقم)

مورخہ ۱۲؍ اپریل ۳۵ء۔ وقت ۴ بجے سہ پہر۔ میں نے سوال کیا، آیہ مبارکہ اِنَّ الَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (جو لوگ ہمارے بارے میں کوشش کرتے ہیں، ہم ضرور انہیں اپنی راہیں دکھلائیں گے) سے کیا مُراد ہے؟ علاّمہ نے فرمایا" تمام علوم و کمالات اور مقاصدِ عالیہ جو نوعِ انسان کے لئے کسی نہ کسی جہت سے مفید ہوں، اُن کے حصُول کی سعی جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے اور اس مشق و مزاولت کے ارتقائی نتائج لَنَھْدِیَنَّھُمْ کا ظہور ہیں" میں نے عرض کیا، مولانا رُوم نے فرمایا ہے:

نُطق آب و نُطق باد و نطق گِل

ہست محسوسِ حواسِ اہلِ دل

اس سے کیا مُراد ہے؟ آپ نے فرمایا: قرآن مجید میں ہے، زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے اور کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ ہر مخلوق کو اپنی نماز اور تسبیح کا علم حاصل ہے اِن آیتوں سے ثابت ہے کہ ہر شئے کو اس کے حال کے مطابق نُطق عطا ہُوا ہے۔ میں نے کہا: مجھے نطقِ اشیاء و عناصر سے انکار نہیں، میرا سوال" محسُوسِ حواسِ اہلِ دل" پر ہے۔ آپ کی پیش کردہ دُوسری آیت کے ساتھ ہی یہ لفظ پڑے ہوئے ہیں: وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ (یعنی ہر شے نمازی اور تسبیح خواں تو ضرور ہے لیکن اے انسانو! تم اس کی سمجھ نہیں رکھتے) پھر اہلِ دل اس نُطق کو کس طرح محسُوس کرتے

ہیں؛ آپ نے یہ شعر پڑھا :

ہر کہ عاشق گشت حُسن ذات را
گشت سیّد جُملہ موجودات را

آپ کی حالت متغیر ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مَیں خاموش ہو گیا۔ اِس کے بعد مَیں نے عرض کیا: معرفتِ الٰہی سے کیا مُراد ہے؟ آپ نے فرمایا: "سیدالطائفہ جنید بغدادی کے نزدیک معرفت یا عرفان کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب یا مضاف نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ قرآنِ عزیز میں اس کا استعمال نہیں کیا گیا، البتہ علم و ایمان کا ذکر بار بار آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ تو عارف ہے، نہ معروف۔ ہاں "عالم و علیم" ہے اور "معلوم" ہے، جس پر بہت سی آیتیں شاہد ہیں اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (اللہ تعالیٰ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں، جو اس کے بندوں میں علم سے ممتاز ہیں) یہاں علما کہا ہے عرفا نہیں کہا۔ مجھے صحیح یاد نہیں کہ یہی آیت پڑھی تھی یا کوئی اور آیت بھی پڑھی تھی۔ اس کے بعد لفظ علم پر گفت و گو ہوئی۔ فرمایا "علم کی دو قسمیں ہیں، ایک ہمارے اکتسابی معلومات کا ذخیرہ۔ ہم خود مخلوقِ الٰہی ہیں اور ہمارے اکتسابی آلاتِ علمیہ ہماری مخلوق، یعنی، ہمارا علم، مخلوق کا مخلوق ہے۔ پس ایسے علم کو علمِ الٰہی سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرا وہ علم ہے، جو خواص کو عطا ہوتا ہے، وہ بے منّت کسب قلب و رُوح کے اعماق سے اُبلتا ہے"۔ مَیں نے عرض کیا، اُس علم کی کلید کیا ہے؟ فرمایا: ارشادِ خداوندی ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا، جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا، اُس پر اس علم کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ مَیں نے کہا: تزکیۂ نفس کا طریق کیا ہے؟ اس پر آپ نے صُوفیہ کے بعض مشاغل کی طرف اشارہ کر دیا۔

اس مقام پر مجھے یاد آگیا، میں نے کسی صحبت میں پوچھا: صوفیہ کے اذکارِ مخصوصہ اور مصطلحات و مدارج (غوث، قطب، ابدال وغیرہ) کا تعلق نفسِ اسلام سے کیا ہے؟ صحابہ میں مومن، صالح، شہید، صدیق وغیرہ الفاظ تو ملتے ہیں، لیکن ان الفاظ کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا؟ آپ نے فرمایا: واقعی جناب رسالتماب صلعم اور صحابہ کرام رض کے زمانہ میں نہ یہ اصطلاحات تھیں اور نہ اس قسم کے اذکار و اوراد۔ اسلامی تصوّف مجوس، ہنود اور نصاریٰ کے تعلقات سے کافی حد تک متاثر ہوا ہے۔

اسی ۱۲ اپریل کی ملاقات میں حضرت مسیح علیہ السّلام کی معجزانہ ولادت اور رفع سماوی کا ذکر ہوا، تو فرمایا "یہ[1] دو چیزیں نومسلم عیسائیوں کی بدولت اسلامی عقاید میں داخل ہوگئیں۔ میں نے پوچھا: اسلام بتمامہ قرآن میں محصور ہے یا نہیں؟ فرمایا: "مفصّل کہو"! میں نے کہا: خارج از قرآن ذخیرہ احادیث و روایات اور کتبِ فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن

---

[1] علّامہ نے اپنے بعض اشعار و خطوط میں بھی جو میرے نام ہیں، اس طرف اشارہ کیا ہے، مثلاً:

مینارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ	اب انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے

اور ــــــ

ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار	وہی مہدی وہی آخر زمانی

مرزا بیدل نے بہت پہلے لکھ دیا ہے:

عالم کہ بوضع خودسری مسرور است	در شیوۂ غفلت حسی مجبور است
باز آمدنِ مسیح و مہدی انجب	از تجربۂ مزاج اعیان دُور است

اس باب میں کفایت کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں، ان کی بھی ضرورت ہے۔ اُن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں، لیکن نفسِ اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آچکا ہے۔ خدا تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔

پھر میں نے پوچھا: مولانا رُوم کے شعر ذیل کی شرح کیا ہے؟

دفترِ صُوفی کتاب و حَرف نیست
جز دلِ اسپید ہمچو برف نیست

اُس وقت علی بخش کو بُلا کر ایک کتاب منگوائی، جس پر غالباً یہ شعر اور اس کے ماقبل و مابعد کے اشعار لکھ کر انگریزی زبان میں اُن کی شرح اپنے قلم سے لکھ رکھی تھی۔ مجھے اُس کا ترجمہ کرکے سمجھا دیا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "عالم قلم پر چلتا ہے اور صُوفی قدم پر"

پھر مولوی کا یہ شعر پڑھا:

زادِ دانشمند آثارِ قلم
زادِ صوفی چیست انوارِ قدم

یہ شعر پڑھ کر بہت روئے۔ اس کے بعد پھر مولوی کا ایک شعر پڑھا، جس کا مفہوم یہ تھا کہ صوفی ہرن کے قدموں کے نشان سے اس کا سراغ لگاتا ہے اور چلتے چلتے بُوئے نافہ تک پہنچ جاتا ہے، پھر بُوئے نافہ کی رہنمائی میں خود ہرن تک جا پہنچتا ہے۔ پھر فرمایا: قلم کی راہ چلنے والا بھی آخر پہنچ ہی جاتا ہے، بلکہ محفوظ طریق سے۔

اس صحبت میں میرے ساتھ ایک خوش گلو رفیق تھا۔ میں نے عرض کیا، اگر آپ کچھ سُننا پسند فرمائیں، تو یہ صاحب حاضر ہیں۔ آپ نے رضامندی ظاہر کی۔ میں نے بالِ جبریل منگوانے کو کہا اُسی وقت منگوائی گئی۔ میں نے خاص خاص نظموں پر جو مجھے بہت پسند تھیں، نشان کر دیئے۔ سب سے پہلے ایک غزل پڑھی گئی، جس کا آخری شعر یہ ہے:

تری بندہ پروری سے میرے دن گذر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ

جب تک یہ غزل گائی جاتی رہی، آپ روتے رہے اور میں بھی اس حالت سے بہت متاثر ہوا۔

یہ صحبت قریباً سوا دو گھنٹے تک قائم رہی۔

۱۴؍اپریل ۳۵ء کو حاضرِ خدمت ہوا۔ میرے ساتھ حکیم طالب علی صاحب تھے۔ ہمارے حاضر ہونے سے پہلے مشہور شاعرہ اور قائدہ مسز سروجنی نائیڈو اور میاں بشیر احمد آف ہمایوں موجود تھے۔ اُن سے انگریزی میں بات چیت ہوتی رہی۔ میں نے شاعرہ کو پہلی اور آخری دفعہ دیکھا اور یہ بات بھی ایک ہی دفعہ دیکھی کہ علامہ، شاعرہ کو رخصت کرنے کے لئے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کوٹھی کے برامدے تک تشریف لائے۔

اس کے بعد جناب عبداللہ یوسف علی اور بعض دیگر اکابرِ حمایت اسلام آگئے۔ کسی خاص موضوع پر میٹنگ ہوئی۔ آخر دیر کے بعد تنہائی نصیب ہوئی ۔۔ میں نے پُوچھا: مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی کس کے متبع ہیں؟ فرمایا: مرزا سے پہلے کوئی شخص اس رنگ میں لکھنے والا نظر

نہیں آتا۔ وہ اپنی طرز کے آپ ہی موجد و مبدع اور خالق و صانع ہیں۔ اُن کے بعد بھی کوئی اس طرز میں کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔

اس کے بعد کئی باتیں ہوئیں، جو خاص طور پہ قابل ذکر نہیں۔ پھر حکیم طالب علی صاحب کے سوال پر مسیح علیہ السلام کی معجزات سے بھری ہوئی زندگی، ولادت اور وفات سے متعلق فرمایا کہ نومسلم عیسائیوں نے اپنے غیر معقول اور خرافیاتی عقاید مسلمانوں میں شائع کر دیئے۔ سادہ لوح مسلمانوں نے ان کو اجزائے اسلام سمجھ کر سر آنکھوں پر اُٹھایا اور ابتدائی مصنّفین نے روایتاً اپنی کتب میں نقل کر دیا۔ اس کے علاوہ ایک صحبت میں آپ نے خاص طور پہ فرمایا کہ بزرگوں کی آمد ثانی کا عقیدہ تمام مذہبی گروہوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ صرف مسلمانوں سے مختص نہیں۔ اس میں یہ مصلحت رکھی گئی ہے، کہ جب کوئی مصلح و مجدد کھڑا ہو، وہ لوگوں کے اس انتظار و اعتقاد سے فایدہ اُٹھا کر ان کو ایک مرکز پر لا سکے۔ مسلمانوں کے مسیح و مہدی کی آمد بھی اسی قبیل سے ہے، ورنہ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ قرآن اس بارے میں قطعاً خاموش ہے" ایک اور بزرگ نے بھی ایک دفعہ اپنا یہی خیال ظاہر کیا تھا جس پر عوام پنجے جھاڑ کر اُن کے پیچھے پڑ گئے۔ آخر اُن کو اپنے الفاظ کی نہایت نازیبا تاویل کر کے جہّال کی زبانیں بند کرنا پڑیں۔ علّامہ کے شعر ذیل میں اسی طرف اشارہ سمجھا گیا ہے:

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت

وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

اس کے بعد میں نے حیات بعد الممات سے متعلق استفسار کیا۔ آپ نے فرمایا: حیاتِ اُخروی انسان کے ذوقِ حیات کی شدّت پر منحصر ہے۔ جس قدر کسی شخص میں ذوقِ زندگی زیادہ ہوگا۔ اتنا ہی اس

کا زمانہ برزخ کم ہوگا۔ شہدا کا ذوقِ زندگی بہت بڑھا ہُوا ہوتا ہے، اس لئے ان کے لئے کوئی برزخ نہیں۔ اس زندگی سے آنکھ بند کرتے ہی اُن کے لئے دوسری زندگی کا دروازہ کھُل جاتا ہے"۔ مَیں نے عرض کیا، عام مومنین کے لئے بھی برزخ کا کہیں ذکر نہیں۔ فرمایا "اس کا سبب بھی ذوقِ حیات ہے۔ مَیں نے اس خیال کو اپنے ایک شعر میں بھی ظاہر کیا ہے:

جائے کہ بخشند دیگر نگیرند

اِنساں بمیرد از بے یقینی

اس کے بعد سلسلہ گفتگو دوسری جانب مُڑ گیا۔ آپ نے فرمایا "یورپ سے آتے ہُوئے ایک صُبح جہاز میں مَیں قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔ میرے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دُعا آگئی وارزق اھلہ من الثمرات رزقاً (خدایا! حرم کعبہ کے اہالی کو پھلوں سے رزق عنایت فرما) اس سے میری طبیعت بے حد متاثر ہُوئی۔ اس دُعا کو زبان سے نکلے ہوئے چار ہزار سال گذر گئے۔ اس کی قبولیت ایک بدیہی حقیقت بن گئی ہے۔ تمام اسلامی ممالک ایران عراق شام افغانستان بیروت ٹرکی وغیرہ جو حرم کعبہ سے روحانی تعلق رکھتے ہیں۔ پھلوں کے رزق سے معمور ہیں، اور غیر اسلامی دُنیا یُورپ، امریکہ وغیرہ اس نعمت خداوندی سے محروم سُبحان اللہ!

۱۶ر جنوری ۱۹۳۸ء ۳ بجے بعد دوپہر۔ بمقام جاوید منزل قریباً ½ ۱ گھنٹہ تک ملاقات رہی۔ دورانِ کلام میں آپ نے فرمایا: علم کے چار ذریعے ہیں اور قرآن مجید نے اِن چاروں کی طرف واضح رہنمائی کی ہے۔ مسلمانوں نے ان کی تدوین کی اور دُنیائے جدید اس باب میں ہمیشہ مسلمانوں کی

منت کش رہے گی۔ پہلا ذریعہ "وحی" ہے اور وہ ختم ہو چکا۔ دوسرا ذریعہ "آثار قدما و تاریخ" ہے جس پر آیات قرآن متوجہ کر رہی ہیں "سیروا فی الارض" اس آیت نے علمِ آثار کی بنیاد رکھ دی، جس پر مسلم مصنّفین نے عالیشان قصر تعمیر کئے۔ ذکّر ھم بایام اللہ، یہ آیت مجید تاریخ کا ابتدائی نقطہ ہے جس نے ابن خلدون جیسے باکمال محقق پیدا کئے۔ علم کا تیسرا ذریعہ "علم النفس" ہے جس کا آغاز وفی انفسکم افلا تبصرون سے ہوتا ہے۔ اس کا حضرت جنید اور اُن کے رفقا و اتباع نے کمال تک پہنچایا۔ آخری ذریعہ صحیفہ فطرت ہے، جس پر قرآن مجید کی بیشمار آیات دلالت کر رہی ہیں مثلاً "الی الارض کیف سطحت" اس علم پر علمائے اندلس نے بہت توجہ مبذول کی۔

آیات متشابہات، فصلت آیاتہ، راسخون فی العلم، وغیرہ آیات کی تطبیق پر حضرت علامہ کی تقریر جو میں پہلے نقل کر آیا ہوں، اسی صحبت میں ہوئی تھی، اس تمام تشریحِ علوم، تفصیلِ آیات اور مساعیِ علمائے اسلام کا ذکر کرنے کے بعد آپ نے فرمایا کہ موجودہ دُنیا اپنے تمام علم و تہذیب اور صنائع و بدائع سمیت مسلمانوں کی "مخلوق" ہے۔ میں نے اس لفظ پر ذرا اظہارِ تعجب کیا۔ آپ نے فرمایا، حقیقی خالق بیشک اللہ تعالیٰ ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی خالق ہو سکتے ہیں، جیسا کہ آیۂ احسن الخالقین سے ظاہر ہے، خدائے پاک تمام دوسرے خالقوں سے احسن ہے۔

اس کے بعد فرمایا "قرآن سے پہلے کسی ارضی یا سماوی کتاب نے انسان کو اس بلند مقام پر نہیں پہنچایا، جس کی قرآن نے اطلاع دی۔ یہ لفظ تم قرآن کے سوا کہیں نہ دیکھو گے۔ "سخر لکم ما فی السمٰوٰت والارض" آج تک تم جن ارضی و سماوی، مہیب یا مفید ہستیوں کو اپنا معبود سمجھتے رہے ہو، وہ سب اور تمام دیگر کائنات تمہاری خدمت کے لئے

خلق کی گئی ہے۔ توحید کا یہ مرتبہ اعلیٰ ماسوا سے بے پروا کر دینے والا، یہ انسانی خودی کا حقیقی عرفان قرآن سے پہلے کہیں نظر نہیں آتا۔“

اس کے بعد سید جمال الدین افغانی اور سر سید احمد خان رحمۃ اللہ علیہما کا تذکرہ چل پڑا۔ فرمایا ”افغانی کا مرتبۂ علم و فضیلت سید سے بدرجہا بلند ہے۔ سید کے فرزند رشید سید محمود کی علمی قابلیت بھی نادرۂ روزگار تھی۔ ان کی قانونی استعداد حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مشابہ تھی۔ میں نے سید احمدؒ کی وفات پر تاریخ کہی تھی، جو ان کی قبر پر کندہ ہے:

اِنِّی مُتَوَفِّیکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَہِّرُکَ

ایک دفعہ میرے ساتھ میاں مولابخش صاحب سوداگر صابون تھے۔ یہ بزرگ امرتسر میں اپنے دینی ذوق کے لئے مشہور ہیں۔ ہمارے ساتھ دو اور صاحب ملاقات کے کمرے میں داخل ہوئے۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ یہ صاحب غالی قسم کے اہل حدیث ہیں۔ ان دنوں علامہ مسیح کی آمد ثانی کے متعلق ایک بیان شائع کرا چکے تھے، جس سے احمدی حضرات ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔ یہ دونوں صاحب اس معاملہ کے متعلق علامہ سے کچھ گفتگو کرنے آئے تھے۔ انہوں نے کہا ”احمدیوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ آپ (علامہ) نے لکھا ہے کہ مسیح کی آمد ثانی کا عقیدہ مسلمانوں نے مجوسیوں سے لیا ہے، کیا آپ نے کہیں ایسا لکھا ہے؟ علامہ نے فرمایا، نہیں! انہوں نے کہا ”آپ تحریر فرما دیں، تاکہ ہم اس کو شائع کر کے احمدیوں کا منہ بند کر دیں“۔ علامہ نے اسی وقت قلم کاغذ منگوا کر اس مطلب کی تحریر لکھ دی۔ ان دونوں صاحبوں نے اس تحریر کو پڑھ کر کہا ”ایک سطر کا اور اضافہ کر دیجیے“۔ جس کا مطلب یہ ہو کہ آپ حدیث شریف کے مطابق مسیح کی آمد ثانی پر اعتقاد رکھتے ہیں“۔ علامہ نے فرمایا ”میرا یہ اعتقاد نہیں

ہے" انہوں نے کہا "کیا آپ کو حدیث کی صحت سے انکار ہے"۔ آپ نے فرمایا "میں اعتقادی امور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں اور حدیث کے متعلق مجھے اور آپ سب کو معلوم ہے کہ ذریعوں سے ہم تک پہنچی ہے" اس بات پر ایک صاحب ذرا گرم ہو کر کہنے لگے "اگر اس طرح حدیث سے بے پروائی کیجائیگی تو مسلمانی ختم ہو جائے گی۔ ہمارا کوئی عمل و عبادت حدیث کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ قرآن تو نماز ایسی روزمرہ کی چیز کے لئے بھی ہمیں کوئی تفصیل نہیں بتاتا۔ یہی وجہ ہے کہ فرقہ اہل قرآن نے اپنے لئے عجیب قسم کی نمازیں تراش لی ہیں جن کا جمہور اہل اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کی نمازوں کے اوقات، اذکار اور رکعات وغیرہ سب عالم اسلامی سے مختلف ہیں۔ کیا ایسی حالت میں آپ ان کو کافر نہیں کہیں گے؟ علامہ نے اس تیز کلامی کے جواب میں نہایت نرمی سے فرمایا "کافر نہ کہو" کوئی اور نام رکھ لو، یہ شدت ہے، تم لوگ نمازوں کی رکعات و اذکار پر لڑتے ہو، مجھے تو سرے سے نماز کا وجود ہی کہیں نظر نہیں آتا (یا یہ کہا تھا کہ خطرے میں نظر آتا ہے) اس کے بعد وہ دونوں صاحب چلے گئے، لیکن گفتگو کا موضوع نہ بدلا علامہ نے بڑے درد سے فرمایا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا اور فتوے بازی اس امر کی دلیل ہے کہ اس قوم میں اللہ والے لوگ ختم ہو چکے ہیں۔ پھر آپ نے وفد ہلال احمر کا وہ قصہ سنایا، جو بعد میں ضرب کلیم میں بصورت نظم شائع ہوا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وفد موصوف کے ایک رکن علامہ کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے شاہی مسجد میں گئے۔ وہ بوڑھے آدمی تھے۔ امام نے نماز میں طوالت اختیار کی۔ وہ تنگ آ گئے۔ باہر آ کر انہوں نے علامہ سے اس طوالت پر تعجب کا اظہار کیا اور اس کا سبب پوچھا، تو علامہ نے کہا "یہ ہندی مسلمان کے بے کار اور بے نصب العین ہونے کی دلیل ہے۔ آپ لوگوں کے سامنے اپنی قوم اور ملت کی تعمیر و تشکیل کا کام ہے، اس لئے آپ کو ایسی بے مصرف نمازوں کی فرصت نہیں۔ اس ملک کے بے کار

مُلّا اور نکمّے مسلمان اگر مذہبی بحث و پیکار اور لمبے لمبے درُود و وظائف میں اپنا وقت صرف نہ کریں، تو کیا کریں؟

ایک صحبت میں مَیں نے علامہ ابن جوزی کی "تلبیس ابلیس" کا ذکر کیا' اِس میں مُصنّف نے کامل جُرأت اور پاک دلی سے ابلیس کے ہتھکنڈوں اور مقدّس مذہبی جماعتوں پر اس کے اثرات کی وضاحت کی ہے۔ اِس ضمن میں صُوفیہ کے معائب بھی دل کھول کر بیان کیے ہیں۔ مَیں نے اِس حصّہ کا کچھ ذکر کر کے حضرت علّامہ کی رائے دریافت کی۔ آپ نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ مَیں نے کہا' علامہ ابن تیمیہ کی روش بھی تصوّف کے خلاف ابن جوزی سے کچھ کم نہیں۔ آپ نے اس پر بھی کچھ ایسے الفاظ فرمائے' جن کا خلاصہ یہ تھا کہ بعض لوگ حقیقت سے واقف نہیں ہوتے اور نظر بر ظاہر عیب چینی شروع کر دیتے ہیں۔

ہنگامہ شہید گنج کے دِنوں میں جب کہ مُسلمانوں کی مختلف جماعتیں اور اخبارات آپس میں پگڑی اُچھالنے کی مشق میں بہت تیزی دکھا رہے تھے۔ مَیں نے عرض کیا' آپ ان لوگوں کے لیڈروں کو بُلا کر صُلح کرا دیں' تو بہت بڑی اسلامی خدمت ہو گی۔ آپ نے فرمایا "امرت سر میں یہ کوشش کرو"۔ مَیں نے کہا "امرت سر میں کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے جو ان پر مؤثر ہو سکے"۔ آپ نے فرمایا کہ "میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ ان کے مُنہ بند کر سکوں۔ مَیں اِن سب کو خوب جانتا ہوں"۔ مَیں نے کہا' آپ کے نزدیک موجودہ ہندی اسلامی تحریکوں میں کونسی تحریک مسلمانوں کے حق میں بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا "عموماً اِن تحریکوں کے قائد جاہل ہیں"۔ احرار کے متعلق کہا "اِن سے کسی قدر اصلاح کی اُمید ہو سکتی ہے"۔

ایک دفعہ مَیں نے پُوچھا۔ مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" میں آپ کے مصرع

علم و حکمت اور کُتب، دیں از نظر

میں "نظر" سے کیا مُراد ہے؟ فرمایا "صحبت"

ایک دفعہ میں نے عرض کیا، فلاں جدید فرقہ صراحتاً متضاد دعاوی اور لغو عقاید کا مجموعہ ہے، لیکن بہت سے اہلِ علم و ثروت اور اصحاب دانش و تجربہ اس میں شامل ہیں، جس سے سطحی عقل کے لوگ بانی فرقہ کی صداقت تسلیم کر لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اِس کے جواب میں آپ نے عقل کی متعدد قسمیں بیان کیں، جن کے لئے انگریزی الفاظ استعمال کئے جو مجھے یاد نہیں رہ سکے۔ مزید تشریح کرتے ہوئے فرمایا: "بعض لوگ بعض مخصوص فنون و اعمال میں کافی بصیرت کے مالک ہوتے ہیں، لیکن بہت سے دُوسرے اُمور میں قطعاً سادہ اور صریح الاعتماد ثابت ہوتے ہیں"۔ اس پر ایک مثال بیان فرمائی کہ۔ "مجھے ایک مُصنّف نے اپنی ایک کتاب جو انگریزی زبان میں معدنیات پر لکھی گئی تھی، تبصرے کے لئے بھیجی۔ مَیں نے اُسے پڑھا تو مجھے اُس فن سے ذوق پیدا ہو گیا۔ تھوڑے عرصہ میں مَیں نے جواہر کے پرکھنے کی مہارت حاصل کر لی۔ ۱۹۰۷ء میں جب ولایت گیا تو ایک لارڈ صاحب کی لیڈی کو میرے اِس ذوق کا علم ہو گیا۔ وہ بھی اِس کی بہت شوقین تھیں اپنے جواہرات کا ڈبّہ اُٹھا کر میرے پاس لے آئیں۔ مَیں ان کے گراں قدر منتخبات کو دیکھتا اور اُن کی مناسب تعریف کرتا رہا۔ اخیر میں اُنہوں نے کہا کہ میرے پاس ایک نہایت اعلیٰ [ا] ... تھا، لیکن افسوس ہے کہ مَیں اُسے جُدا کرنے پر مجبور ہو گئی۔ مَیں نے کہا، آپ مجبور کیوں ہو گئیں؟ انہوں نے کہا، مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ میری قسمت کے موافق نہیں"۔ اس سے اندازہ لگا لو کہ وہ عورت بڑی اہل علم و تجربہ ہونے کے باوجُود کتنے پست وہم میں گرفتار تھی، اسی طرح بعض آدمی قانون میں بڑے ماہر ہوتے ہیں، جب وہ کسی مذہبی مدعی کی بزرگی تسلیم کر لیتے ہیں تو عوام کو دھوکا ہوتا ہے

[ا] کوئی قیمتی پتھر تھا جس کا نام یاد نہیں رہا (منہ)

کہ اتنے قانون دان نے اس کو بزرگ مانا ہے، ضرور اس میں کوئی بزرگی ہوگی، حالانکہ وہ قانون دان مذہب کی حقیقت سے اتنا ہی کورا ہوتا ہے جتنا ایک عامی انسان۔ اسی طرح اکثر لوگ مذہبی کتب پر عبور رکھتے ہوئے بھی صحیح مذہبی حس نہ رکھنے کے باعث فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ علم جوتش کا ذکر ہوا۔ فرمانے لگے "میرے ایک پنڈت دوست نے اپنے اُستاد سے جو بنارس میں اِس فن کا بہت ماہر تسلیم کیا جاتا تھا، جاوید کی ولادت پر جنم پتری بنوائی، میں اس کا قائل نہیں ہوں، اس لئے میں نے اس پر کچھ توجہ نہ کی۔ چند دِن گذرے، بڑے بھائی صاحب نے وہ پتری نکال کر دیکھی اور مجھے بھی دکھائی۔ اس میں علاوہ اور باتوں کے یہ بھی لکھا تھا کہ "یہ بچہ . . . سال کی عمر کو پہنچے گا تو اس کا والد لمبی بیماری میں مبتلا ہو جائے گا۔ اور یہ خود سال تک معدہ (یا شاید جگر) کے مرض میں مُبتلا رہے گا۔" تعجب ہے کہ یہ دونوں باتیں صحیح ہو رہی ہیں۔

ایک دفعہ اسلام یا مُسلم کی تعریف میں ایک بلیغ و عمیق تقریر فرمائی، جس کو میں بمشکل سمجھ سکا، اس وقت اس کا دُھندلا سا اجمال دماغ میں موجود ہے۔ کچھ ایسا مفہوم تھا، کہ انسان صحیح معنوں میں مُسلم اُس وقت ہوتا ہے، جب قرآن کے فرمائے ہوئے اوامر و نواہی اس کی اپنی "خواہش" بن جائیں یعنی، وہ یہ نہ سمجھے کہ میں کسی حاکم یا آقا کے حکم و تسلّط کے ماتحت فضائل اخلاق و عبادات پر کاربند اور ذمائم و قبائح نفس سے مجتنب ہوں، بلکہ یہ چیزیں اُس کی اپنی تمنا بن کر اُس کے عمقِ رُوح سے اُچھلیں قرآن اس کے حق میں ایک تلخ اور شافی دوا نہ رہے بلکہ ایک لذیذ اور زندگی بخش غذا بن جائے منشائے الٰہی اور فطرتِ انسانی میں مغائرت نہ رہے۔ یہی مطلب ہے فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا الخ کا۔ اس پر تاریخ سے بعض مثالیں بھی دیں جو بالکل بھول گئی ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ یہ تمام داستان طویل عرصہ کے بعد ایک کمزور حافظہ کی مدد سے مُرتّب کی گئی ہے، اس لئے اس میں بالکل وہی کچھ نہیں ہے جو علّامہ مرحوم کی زبان سے نکلا۔ بعض جگہ اشارات تفصیل کی صورت میں آ گئے ہیں اور بعض جگہ تفصیل اشارات میں ہو گئی ہے۔ تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ کوئی بات جو ان کے عقاید کے خلاف ہو۔ اُن کے ذمے لگانے سے احتراز کیا جائے۔ ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطانا۔

میرا اقبال

مرزا جلال الدین بیرسٹر ایٹ لاء

غالباً ۱۹۰۵ میں مَیں نے پہلی مرتبہ ڈاکٹر سر محمدؒ اقبال علیہ الرحمۃ کو دیکھا۔
لندن میں حصولِ تعلیم کی غرض سے اپنے قیام کے آخری دِنوں میں سر عبد القادر اور مَیں ایک ہی مکان میں چند دن کے لیئے ٹھہرے ہوئے تھے۔ اِن سے جب کبھی وطن اور ابنائے وطن کے متعلق باتیں ہوتیں تو ان کی زبان پر سر محمدؒ اقبال کا تذکرہ ضرور آتا۔ در اصل میرے کان ہندوستان ہی میں ان کے نام سے آشنا ہو چکے تھے۔ مخزن میں اکثر ان کی نظمیں شائع ہوا کرتیں۔ ان کے مطالعہ سے ان کی طبیعت کے ہیجان و طغیان کا پتہ چلتا تھا۔ مگر اس زمانے میں چونکہ بساطِ ادب پر حالی۔ شبلی۔ نذیر احمدؒ وغیرہ کا قبضہ تھا اس لئے اقبال کی شخصیت کچھ ایسی جاذبِ توجہ نہ تھی کہ اس سے ملنے اور اس کی صحبت سے مستفید ہونے

کی خواہش پیدا ہوتی، بہر صورت میں حصولِ تعلیم کے بعد جب ہندوستان واپس آیا۔ تو سر عبد القادر نے لندن سے مجھے ایک خط میں لکھا کہ ان کے دوست شیخ محمد اقبال بھی انگلستان جانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور انہوں نے ان کو لکھ بھیجا ہے کہ وہ چلنے سے قبل سفر اور قیامِ انگلستان کے متعلق ضروری معلومات مجھ سے حاصل کر لیں۔ چنانچہ چند دن بعد شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی صاحب مرحوم کے ساتھ جو میرے پڑوسی تھے۔ اقبالؔ میرے مکان پر تشریف لائے اور سید صاحب کے توسط سے جو ہم دونوں کے مشترک دوست بھی تھے۔ ہمارا تعارف ہوا۔ یہ میری اور اقبالؔ کی پہلی ملاقات تھی۔

اقبالؔ کی عمر اس وقت غالباً تیس کے قریب ہو گی۔ ان کے چہرہ کے خدوخال کی موزونیت ان کے قد و قامت کا تناسب اور ان کے جسم کی ساخت انہیں انفرادی خصوصیات کی حامل تھیں جن کی وجہ سے پنجابی ہر جگہ ممیز کئے جاتے ہیں۔ ان کے چہرے پر ایک ایسی بشاشت نظر آتی تھی جو آخر دم تک ان کے ساتھ رہی اور وفات کے بعد بھی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ چھدری مونچھیں اور آنکھوں پر اُلجھے ہوئے ابرو عین اسی طرح تھے۔ جس طرح میت کے آخری دیدار پر مجھے نظر آئے۔ میری ملاقات کے وقت ان کی روشن و بشاش آنکھیں صاف ظاہر کرتی تھیں کہ ان کے دن خوش وقتی اور اطمینان میں بسر ہو رہے ہیں۔ ان امور کے علاوہ اقبالؔ کے چہرے یا ان کی حرکات و سکنات سے کوئی ایسی بات مترشح نہ ہوتی تھی۔ جس سے میں اقبالؔ کے متعلق یہ اندازہ لگا سکتا۔ کہ کوئی دن جاتا ہے اس شخص کے افکار انسانی خیالات کی دُنیا میں ہیجان و انقلاب کا موجب ہوں گے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ملاقات کے دوران میں میرا خیال رہ رہ کر ان کی شاعرانہ حیثیت کی طرف منتقل ہوتا۔

ہماری ملاقات مختصر اور رسمی تھی۔ بس یوں سمجھ لیجئے۔ کہ وہ سوال کرتے رہے اور میں جواب

دیتا رہا۔ یا یوں کہئیے۔ کہ وہ خاموشی سے سُنتے رہے اور میں انگلستان کی زندگی کے متعلق اس قسم کے افسانے سُناتا رہا جو ہمارے نوجوان اس ملک سے لوٹنے پر اپنی فتوحات کے سلسلے میں سُنایا کرتے ہیں۔ چند دن بعد میں نے مولوی ممتاز علی صاحب مرحوم کی زبانی سُنا کہ اقبال انگلستان روانہ ہوگئے ہیں۔ اس کے بعد کم و بیش تین سال تک مجھے ان کے کوائف و حالات سے کسی قسم کی کوئی خبر نہیں ملی۔ مگر ان کی واپسی سے کچھ عرصہ پیشتر میرے کانوں میں ان کا نام پھر پڑنے لگا اور وہ اس طرح کہ ضلع کی کچہری میں قانونی مشاغل کے بعد جب ذرا سستانے کی غرض سے شیخ گلاب دین اور مولوی احمد دین کے پاس بیٹھنا پڑتا۔ تو اقبالؔ کا تذکرہ کبھی چھڑ جاتا۔ مولوی احمد دین مرحوم ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ جس کی وجہ سے وہ ڈاکٹر صاحب کا تذکرہ اس انہماک و شغف سے کرتے کہ مجھے بھی اُن سے پھر ایک مرتبہ ملنے کی خواہش پیدا ہوگئی اور جب لاہور کے دوست ان کے استقبال کے لئے ریلوے سٹیشن پر گئے۔ تو میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ اقبالؔ سے چند ماہ قبل شیخ عبدالقادر صاحب بھی مراجعت فرمائے وطن ہوئے تھے اور ان کے استقبال پر بھی میں موجود تھا مگر قدرتی طور پر اپنی شان اور چہل پہل کے لحاظ سے اقبالؔ کا استقبال شیخ صاحب کے استقبال سے بہت کم درجے کا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ عبدالقادر مخزنؔ کے ذریعہ لوگوں میں بہت محبوب تھے۔ اقبالؔ کی حیثیت ابھی اُردو دُنیا میں نو وارد کی تھی۔ جس کی طبیعت کے لاتعداد جوہر آیندہ چل کر کھلنے والے تھے۔ ان کی واپسی پر بھاٹی دروازہ کے باہر بلدیہ کے باغ میں شیخ گلاب دین مرحوم نے اُن کے اعزاز میں ایک دعوت دی۔ ڈیڑھ ایک سو آدمی شامل ہوئے اور دو تین اصحاب نے خیر مقدم کی نظمیں پڑھیں۔ دراصل اسی صحبت میں میرے اور اقبالؔ کے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔

پارٹی سے فارغ ہوتے ہی اقبال سیالکوٹ چلے گئے۔ چند دن بعد جب وہ واپس لاہور آئے

تو پہلے پہل انہوں نے منشی گلاب سنگھ کے چھاپے خانے کے عقب میں چند کمرے رہائش اور دفتر کے لئے کرایہ پر لئے۔ اس کے چند ماہ بعد وہ انارکلی میں وہاں اٹھ آئے۔ جہاں کبھی میاں محمد شفیع مرحوم کا دفتر ہوا کرتا تھا میری رہائش ان دنوں چیمبرلین روڈ پر تھی۔ اس قربِ مکانی کی وجہ سے ان سے ملنے جلنے میں مجھے اور بھی سہولت مہیا ہو گئی۔ جس کی بنا پر کچہری سے فارغ ہونے کے بعد ہم ایک دوسرے کے مکان پر بھی کافی دیر ملتے۔ انہیں ایام میں میاں شاہنواز مرحوم بھی ہم میں آملے اور ہمارے ایسے جلیس ہوئے کہ ان کے وقت کا اکثر حصہ ہمارے پاس بسر ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب نے وکالت شروع کی۔ تو انہوں نے ضلع کچہری پر چیف کورٹ کو ترجیح دی اور براہ راست وہیں پریکٹس شروع کی۔ اسی دوران میں گورنمنٹ کالج لاہور کی طرف سے ان کی خدمت میں استدعا کی گئی۔ کہ وہ طلباء کو فلسفہ پڑھا دیا کریں۔ پہلے تو ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ درس تدریس کا یہ سلسلہ ان کے قانونی مشاغل میں حارج ہوگا مگر گورنمنٹ کالج والے پہلے ہی سے اس جواب کے لئے تیار ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے سیدھا چیف جج کو جا پکڑا اور اس سے حکم لکھوایا۔ کہ ڈاکٹر صاحب کا کوئی مقدمہ ۱۱ بجے سے قبل پیش نہ ہوا کرے۔ کچھ عرصہ یہ مشغلہ بھی جاری رہا۔ مگر بعد میں محکمۂ تعلیم پنجاب نے ان سے درخواست کی۔ کہ وہ وکالت سے کلّی طور پر علیحدگی اختیار کر کے کالج میں شعبۂ فلسفہ کی کرسی کو زینت بخشیں۔ اس ضمن میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو آئی۔ ای۔ ایس میں لے لینے کا بھی وعدہ کیا۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب آئی۔ ای۔ ایس کے کچھ اتنے مشتاق نہ تھے۔ کہ وہ وکالت جیسا آزاد پیشہ ترک کر کے اپنے پاؤں میں بیڑی ڈال کر بیٹھ جاتے۔ انہوں نے دوستوں سے مشورہ کیا اور ہم سب نے یہی رائے دی کہ سرکاری ملازمت میں اول تو قوتِ عمل کے سلب ہونے کا احتمال ہے۔ دوسرے محکمۂ تعلیم میں وسعت کے امکانات بہت محدود ہیں۔ چنانچہ اگر سرکاری ملازمت ہی پر نگاہ ہو تو وکالت ہی کیوں نہ رکھی جائے۔

جس میں ترقی کے جملہ مدارج میں جج کا عہدہ بھی ہے۔ اس پر انہوں نے کالج سے تعلقات منقطع کر لئے اور وکالت پر اکتفا کی۔

اس زمانے میں بار روم میں ایسے افراد بکثرت تھے۔ جو بعد کو جلیل القدر عہدوں پر فائز ہوئے اور حکومت کی نظر میں رفیع المرتبت خطابات کے مستحق ٹھہرے۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے۔ جب لالہ شادی لال، مولوی شاہ دین، میاں محمد شفیع، میاں فضل حسین، لالہ لاجپت رائے، پنڈت شونرائن شمیم اور دیگر کئی نامور وکلاء ابھی پریکٹس کے مدارج طے کر رہے تھے اور ان کی موجودگی نے بار روم کی رفعت ایسی بلند کر رکھی تھی کہ بایدوشاید اقبال بھی اسی عہد میں بار روم میں داخل ہوئے۔ وہ اپنے مقدمات کی تیاری میں خاص انہماک سے کام لیتے اور بڑی محنت سے ان کو تیار کرتے۔ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں ظرافت کو بہت دخل تھا۔ وہ فارغ اوقات میں بار روم میں بیٹھ کر جب اپنی پر لطف باتوں اور ظریفانہ گفتگو کو شروع کرتے۔ تو متعدد افراد ان کے گرد اگرد جمع ہو جاتے۔ ہندوؤں میں پنڈت شونرائن شمیم کو اقبال سے خاص انس تھا اور وہ ڈاکٹر صاحب کی باتوں میں خاص دلچسپی لیتے۔ اس دوران میں میرے اور ڈاکٹر صاحب کے تعلقات بہت گہرے ہو چکے تھے۔ ہمارا معمول یہ تھا۔ کہ دس بجے کے قریب ہم چیف کورٹ میں پہنچتے۔ مقدمات کے شروع ہوتے تک ادھر ادھر کی گپ چلتی اور جب کوئی مقدمہ ختم ہو جاتا۔ تو دوسرے کے شروع ہونے تک پھر بار روم میں آجاتے۔ منشی طاہر دین کی جیب میں قینچی کے سگرٹوں کی ڈبیا پڑی رہتی۔ ڈاکٹر صاحب سگرٹ سلگا کر کرسی پر بیٹھ جاتے اور لطائف و پر مذاق باتوں سے وقت کاٹتے۔ بعد میں تو یہاں تک نوبت پہنچی۔ کہ اکثر عدالتِ عالیہ کے کام سے فارغ ہو کر وہ میرے ہمراہ میرے دفتر میں تشریف لے آتے اور رات دیر گئے تک میرے پاس ہی ٹھہرتے۔

انہیں ایام میں اقبال کی ملاقات نواب سر ذوالفقار علی خاں مرحوم کے ساتھ بھی ہو گئی اور اسی طرح

سرجوگندر سنگھ جوگی سے مراسم قائم ہوگئے۔ ذوالفقار مرحوم۔ اقبال اور میں کبھی نواب صاحب کے دولت خانے پر اور کبھی میرے دفتر میں قریب قریب بلاناغہ ملا کرتے۔ ہمارے باہمی تعلقات ایسے گہرے تھے کہ سرمیاں محمد شفیع مرحوم و فضل حسین مرحوم ہمیں Trio اصحاب ثلاثہ کے نام سے یاد کیا کرتے۔ بعد میں اس ٹرایو میں شیخ اصغر علی صاحب (ریٹائرڈ فینانشل کمشنر پنجاب) کا بھی اضافہ ہوگیا۔ مگر انہیں ملازمت کی متعدد مصروفیات کی وجہ سے ملنے کا زیادہ وقت نہ ملتا۔ سرعبدالقادر صاحب بھی لائل پور جانے سے پہلے کبھی کبھی اس بزم کو رونق بخشا کرتے اور یوں یہ حلقہ احباب پھیل گیا اور اس کی دلکشی میں ایک گونہ اضافہ ہوگیا۔

اقبال انگلستان سے تشریف لائے۔ تو ان کی عظمت ان کی جلیل القدر شاعری کی وجہ سے تھی۔ لوگ ان کے تبحر علمی اور حکیمانہ ژرف نگاہی سے واقف نہ تھے لیکن کچھ عرصہ بعد ایک جلسہ میں جو احمدیہ جماعت کی طرف سے جو ابھی قادیانی اور لاہوری پارٹی کے جھگڑوں میں نہ الجھی تھی۔ کیلیانوالی سڑک پر منعقد ہوا ڈاکٹر صاحب نے ایک پر مغز مقالے میں مذہب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ آپ کا مضمون انگریزی میں تھا۔ جس کی زبان اس قدر عالمانہ تھی کہ ہر شخص کا فہم و ادراک اس کو سمجھنے سے قاصر تھے یہ پہلا موقع تھا۔ کہ لوگوں کے دلوں پر ان کی بالغ نظری۔ عالمانہ استعداد اور فلسفیانہ لیاقت کا نہایت گہرا اثر ہوا۔ اور وہ آئندہ کے لئے ایک جلیل القدر شاعر کے علاوہ ایک رفیع المرتبت عالم بھی سمجھے جانے لگے۔ اس طرح جب اقبال کی عالمانہ حیثیت کی طرف لوگوں کی آنکھیں کھلیں تو تمام حلقوں میں ان کا چرچا ہونے لگا۔ چنانچہ اس کے بعد جب کبھی کوئی سوشل اجتماع ہوتا تو مسئلہ صدارت میں بڑی کشمکش ہوتی۔ اس وقت تک میاں محمد شفیع مرحوم کا نام اس قسم کی مجالس کی صدارت کے لئے واحد طور پر پیش ہوا کرتا تھا۔ اب لوگ اقبال کی عظمت سے روشناس ہوئے تو ان کا نام بھی اعزاز کے لئے تجویز ہونے لگا۔ اور شفیع مرحوم کے مقابلہ پر احمدیہ جماعت اقبال کا نام

پیش کرتی۔ مگر ڈاکٹر صاحب کی اپنی کیفیت یہ تھی کہ وہ ایسے مواقع پر ہمیشہ اپنے دوست سر ذوالفقار علیخاں کے لئے کوشش کرتے۔ اسی کشمکش کی وجہ سے ان مجالس میں اچھی خاصی گرمی پیدا ہو جاتی اور صدارت کا مسئلہ بڑا دلچسپ رہتا۔

اس زمانہ میں پنجاب میں محض دو تحریکیں مسلمانوں کی توجہ کا مرکز تھیں۔ ایک مذہبی دوسری سیاسی مذہبی تحریک مرزا غلام احمد صاحب کی تھی اور سیاسی مسلم لیگ کے نام سے موسوم تھی۔ یہ دونوں تحریکیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے اس زمانے کے تمام پڑھے لکھے مسلمانوں کی جملہ توجہات کا مرکز تھیں۔ لہذا قدرتی طور پر ان دونوں تحریکوں نے ڈاکٹر صاحب کو بھی اپنی جانب متوجہ کیا۔ جہاں تک مرزا صاحب کی تحریک کا تعلق تھا۔ اقبال نے اس کا مطالعہ کیا۔ لیکن اس کے مطالعہ کے باوجود انہوں نے اس وقت اس تحریک سے اپنی بیزاری کا وہ اظہار نہیں فرمایا۔ جو بعد کو انہوں نے نظم اور نثر دونوں میں شدت سے کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس زمانے سر سید علیہ الرحمتہ کی تعلیم کا بہت چرچا تھا۔ جن افراد کی نظروں میں سر سید جیسے بزرگ کی انقلاب انگیز تحریریں رہتی تھیں۔ ان کے لئے مرزا غلام احمد صاحب کے خیالات کچھ زیادہ اہم نہ تھے۔ میں چونکہ سر سید کا مداح اور طالب علم تھا اس لئے مذہبی بحثوں کے دوران میں میرے اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان ان کی آراء و افکار کا تذکرہ آجاتا۔ جہاں تک سر سید کے خیالات میں اصلاح کا پہلو تھا۔ وہ سر سید کے مداح تھے۔ لیکن جہاں تک ان کی تفسیر کا تعلق ہے وہ اس سے اپنے اختلاف کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکتے۔ چنانچہ ایسے مواقع پر میں ان سے ہمیشہ یہی کہا کرتا۔ کہ وہ متنازعہ نکات کی وضاحت کی خاطر قرآن پاک کی تفسیر خود کیوں نہیں لکھتے۔ اس امر پر انہوں نے کئی مرتبہ آمادگی کا اظہار فرمایا۔ مگر جب وقت اچھی لائبریری اور ضروری مواد کے فقدان کا خیال آتا۔ تو وہ مایوس ہو جاتے۔ میں سیاسی مسائل میں ڈاکٹر صاحب کا ہم خیال تھا۔ ان کی

طرح میرا بھی یہی ایمان تھا۔ کہ مسلمان کسی دوسری سیاسی جماعت میں مدغم ہو کر اپنی ملی حیثیت کو کھو دینے کی بجائے اپنی سیاسی تنظیم کے لئے خود کوشش کریں۔ چنانچہ اپنے زمانہ طالب علمی میں ہم نے لندن میں انہیں مقاصد کے پیشِ نظر پانِ اسلامک سوسائٹی کے نام سے ایک نیم سیاسی انجمن قائم کر رکھی تھی۔ جس کے جنرل سیکرٹری سر عبداللہ سہروردی تھے اور سر سلطان احمد اور میں جائنٹ سیکرٹریز تھے۔ میری واپسی کے بعد جب اقبال وہاں پہنچے۔ تو یہ سوسائٹی قائم تھی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر جب وہ وطن واپس آئے۔ تو صوبائی مسلم لیگ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ اس لیگ کے صدر مولوی شاہدین مرحوم تھے۔ سر محمد شفیع سیکرٹری تھے اور میں اسسٹنٹ سیکرٹری۔ اقبال آئے تو قدرتی طور پر لیگ کی جاذبیت نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ بھی ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو گئے۔ لیگ کے خیالات تو خیر ماڈریٹ تھے۔ مگر اس زمانے کی کانگرس بھی کچھ اتنی انتہا پسند نہ تھی۔ پھر بھی حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم جو کانگرس کے بہت بڑے حامی تھے جب کبھی لاہور یا شملہ تشریف لاتے تو سیاسی مسائل پر ان سے ڈاکٹر صاحب کی بڑی گرما گرم بحث ہوتی جو کئی کئی گھنٹوں تک جاری رہتی اور جس کے دوران میں ڈاکٹر صاحب کی بذلہ سنج اور ظرافت پرور طبیعت کے جوہر خوب کھلتے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب سیاسیات میں عملی طور پر کبھی داخل نہیں ہوئے۔ کیونکہ ان کی طبیعت اس زحمت سے ہمیشہ نفور رہی۔ گو وہ پہلے اور پھر اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل لیگ کے رکن تھے۔ مگر ان کی طبیعت کو فطری طور پر سیاست سے مناسبت نہ تھی نہ انہوں نے اپنی زندگی بھر میں کبھی سیاسی قائد بننے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا۔ کہ سیاسیاتِ ہندی اپنی نوعیت کے لحاظ سے مایوس کن ہیں۔ غیر ملکی حکومت کیسے اربابِ قضا و قدر سے جو سات سمندر پار بیٹھ کر اس ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ کسی قسم کے سیاسی ہنگامے سے متاثر ہونے کی کم امید ہے اور جب تک ہندوستان کی حکومت کا سرچشمہ انگریز ہے۔

مسلمان اپنے مفاد کے لئے اس سے کچھ نہیں پا سکتا اور اس کی تمام جدوجہد اپنے مفید جوہر کو رائیگاں کرنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ وہ ایسی سیاسی قیادت کو سوائے وقتی شور و شغب کے اور کچھ نہ سمجھتے۔ بلکہ وہ اس سلسلے میں اس قدر مایوس تھے کہ انجمنِ حمایتِ اسلام جیسے ادارے اور اسلامیہ کالج جیسے دار العلوم کی مجلس انتظامیہ کے صدر ہونے کے باوجود ان کی کارروائیوں سے بڑی بے رخی برتتے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ حکومت سے امداد لینے کی وجہ سے دونوں کا دائرہ عمل محدود ہو چکا ہے اور ان اداروں کی ترقی کیلئے کسی نئے لائحہ عمل کا تجویز کرنا ناممکن ہے۔ اقبال کا تفکر و تدبر محض اسی اسلامی سیاست تک محدود تھا۔ جس کا ذکر کلام پاک میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ اسی سیاست کو انہوں نے اپنا موضوعِ سخن بنایا اور اسی نکتہ پر ان کے خیالات ابتدا سے آخر تک مرکوز رہے اور یہ نکتہ وحدتِ ملی تھا۔ اس کے سوا وہ کسی اور سیاست کو درخورِ اعتنا تصوّر نہ کرتے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ ان کو سیاستِ ہندی سے کس قدر لگاؤ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب کبھی سال بعد کونسل کی رکنیت کے لئے انہیں آمادہ کیا گیا۔ تو ان کے مشیران کار اس امر کو نظر انداز کر گئے کہ اقبال کی طبیعت کو اس جنس سے کوئی نسبت نہیں۔ لہٰذا نتیجہ اتنا ہی حوصلہ شکن اور مایوس کن تھا۔ جتنی توقع تھی شاید سیاست میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے۔ جو کام خواہ کم کرے۔ مگر باتیں زیادہ بنائے۔ اقبال اوّل تو ابن الوقت نہ تھے۔ دوم وہ ایسی سیاست پر اپنا وقت ضائع کرنا عقلمندی تصوّر نہ کرتے تھے۔ جس کا ماحصل سوائے چند تقریروں کے اور کچھ نہ ہو۔ اس مقام پر سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر معاملہ ایسا ہی تھا۔ تو پھر اقبال رکنیت کے لئے کیوں کھڑے ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں کونسل کی رکنیت کو آئندہ ترقی کے لئے ایک زینہ سمجھا جاتا تھا اور ڈاکٹر صاحب بھی فطری طور پر ترقی کی خواہش سے بے نیاز نہ تھے۔ اس کے علاوہ لوگوں کے اصرار نے بھی انہیں اس کام پر آمادہ کیا۔ جہاں تک فلسفیانہ کاوش اور شعر و سخن کا تعلق تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے رفیع المرتبت

دماغ میں اس قدر ذکاوت اور ان کے فکرِ بلیغ میں اس قدر رسائی تھی۔ کہ ان کے جملہ ادراک مافوق الفطرت تھے اور ان کے متعلق آج کچھ کہنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے مگر اپنے ذاتی معاملات کے متعلق رائے قائم کرنے میں ڈاکٹر صاحب بالکل بے بس تھے اور ان کا عجز صاف نظر آنے لگتا۔ چنانچہ وہ اس ضمن میں معمولی لوگوں کی طرف رجوع کرتے۔ اور ان کی آراء کے عیب و صواب کو جانچے بغیر ان پر عمل پیرا ہونے تک تامل نہ فرماتے۔ نتیجہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب اپنے معاملات انہیں پر چھوڑ دینے کے عادی سے ہو گئے۔ ان کا یہ طرزِ عمل ان کے دیرینہ دوستوں کو پسند نہ تھا۔ چنانچہ کچھ تو خود پیچھے ہٹ گئے اور بعض کے متعلق انہیں حضرات کی مساعی سے ڈاکٹر صاحب کے دل میں غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں جو آخر وقت تک رفع نہ ہو سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی تمام تر قابلیتوں کے باوجود مردم شناسی میں مشّاق نہ تھے۔ ورنہ وہ اپنی مجلس میں بیٹھنے والے لاتعداد افراد میں سے جوہرِ قابل کو ضرور تلاش کر لیتے اور اپنے بعد انہیں بھی سرسید علیہ الرحمتہ کی طرح کام کرنے والوں کی ایک ایسی جماعت مل جاتی جو ان کی جلیل القدر تعلیم کے علم کو بلند رکھتی اور ان کے فیضان کا سلسلہ بدستور جاری رہتا۔

مَیں ابتدا سے الیکشن کے خلاف تھا۔ مجھے علم تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کو اس قسم کی سیاست سے کوئی لگاؤ نہیں۔ مبداءِ فیاض سے جو طبیعت ان کو عطا ہوئی وہ اس قسم کی ہنگامہ خیزیوں سے مانوس نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب وہ الیکشن کے لئے بالکل آمادہ ہو گئے تو ہمیں یہ خیال گذرا کہ اگر وہ کونسل میں جانا ہی چاہیں۔ تو کم از کم انہیں بلا مقابلہ منتخب کیا جائے۔ اس زمانے تک ڈاکٹر صاحب کا شہرہ دُور تک پہنچ چکا تھا۔ اور ان کا نام خاص احترام کا مستحق تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ڈاکٹر صاحب کے مقابلے پر خان بہادر ملک محمد دین کھڑے ہو گئے۔ اس افسوسناک واقعہ سے ہندوؤں میں مسلمانوں کی جس قدر سبکی ہوئی۔ وہ محتاجِ توضیح

نہیں اور ستم یہ تھا کہ ملک صاحب کے کارکنوں میں اکثر افراد ایسے تھے۔ جو ڈاکٹر صاحب کی عظمت سے ناآشنا تھے۔ بلکہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور محرم علی چشتی جیسے باخبر حضرات ان کے کام کرنے والوں میں سے تھے اور اس سب پر مستزاد یہ کہ ڈاکٹر صاحب کو بہ نفس نفیس ووٹ طلبی کی خاطر اکثر شہر کے محلوں اور کوچوں میں لے جایا گیا۔ یہ سب باتیں ان کی بے نیاز طبیعت کے منافی تھیں۔ لیکن جب ان کو رکنیت کیلئے کھڑا کر ہی دیا گیا تھا تو وہ کیا کرتے۔ خیر جب انتخاب کے بعد اقبال کونسل میں گئے تو اس کی کارروائیوں سے انہوں نے اسی بے رخی سے کام لیا۔ جو ان کا معمول تھی۔ اس پر ان کے متعلق طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور ان پر غیر عملی اور تساہل پسند ہونے کا الزام دیا جانے لگا۔ اول تو اقبال ان معنوں میں عملی انسان ہی نہ تھے کہ وہ زبان سے جن خیالات کا اظہار فرماتے۔ جھٹ ان پر عمل کر کے دکھا بھی دیتے۔ دوسرے کسی شاعر کے قول و عمل میں تطابق ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ اتنا ضروری بھی نہیں۔ تیسرے ڈاکٹر صاحب محض اپنے آپ کو عملی ثابت کرنے کی نیت سے زیادہ باتیں بنانا بھی نہ جانتے تھے۔ چنانچہ جو لوگ ان پر بے عمل ہونے کا الزام دیتے ہیں۔ وہ انہیں لوگوں کی طرح غلطی پر ہیں۔ جو اقبال کو محض شاعر ہی تصور کرتے ہیں اور ان کے افکار کو شعر و سخن کے مقررہ قواعد سے جانچ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں۔ کہ اقبال نہ محض شاعر تھا نہ سیاسی لیڈر بلکہ ایک اسلامی فلاسفر۔ یہ معاملہ دوسرا ہے کہ اس نے اپنے افکار کے اظہار کے لیئے نثر کی بجائے نظم کو انتخاب کیا اس صنف ادب کو بھی وہ جان بخشی۔ کہ باید و شاید

خیر بات کہیں کی کہیں جا نکلی میں بتا رہا تھا۔ کہ اقبال کی واپسی پر پنجاب میں کونسی تحریکیں کام کر رہی تھیں۔ اور قصہ چھڑ گیا ان کے انتخاب کا بہر صورت اقبال ہر شام بلا ناغہ میرے ہاں تشریف لاتے۔ ان کو راگ رنگ کا بہت شوق تھا۔ میرے مکان پر چونکہ رقص و سرود کی محفلیں اکثر جما کرتیں

اس لئے وہ ان مجالس میں بڑی رغبت سے شمولیت فرماتے۔ مَیں نے دیکھا کہ بعض اوقات رقص و سرود ہی کے دوران میں آپ اپنی کسی نظم کی بنیاد رکھ دیتے۔ گانا جاری ہوتا۔ کہ اقبالؔ کا قلب جذبات سے متاثر ہونے لگتا اور وہ ایک دھیمی آواز میں گنگنانا شروع کر دیتے۔ جس کے ساتھ ساتھ اپنے داہنے زانو کو ہاتھ سے تھپکتے جاتے۔ اس کیفیت کے آشکارا ہوتے ہی اربابِ نشاط کو فی الفور گانے سے بند کر دیا جاتا اور ہم ہمہ تن گوش ہو کر اقبالؔ کی آواز کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ جو آہستہ آہستہ بلند ہوتی جاتی سازندے جو اقبالؔ کی طبیعت سے واقف ہو چکے تھے۔ نہایت مدھم سُروں میں ایک قسم کی تال سی دیتے تھے۔ جس کے ساتھ وہ اپنی ایک مخصوص لَے میں جس کی دلکشی کا اظہار الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا اپنے اشعار پڑھنا شروع کر دیتے۔ ان کی آواز سازوں کی ہم آہنگی کی وجہ سے کچھ ایسی دلنواز ہو جاتی کہ ایک سماں سا بندھ جاتا۔۔۔ ان کے پڑھنے کے بعد چونکہ پھر گانے کی مجلس کا لُطف قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے گویوں کو رخصت کر دیا جاتا۔

"یا رب دلِ مُسلم کو وہ زندہ تمنّا دے"

والی نظم کی بنیاد بھی ایک ایسی ہی مجلس میں رکھی گئی تھی اور ملّی ترانہ کا پہلا شعر بھی اسی حالت میں موزوں ہُوا تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ اقبالؔ کے کلام کا بیشتر حصہ شب کی تنہائی میں مرتب ہوتا تھا۔ مگر ایسی صحبتوں میں ڈاکٹر صاحب کی طبیعت جوش پر آجاتی۔ میری ملاقات سے بیشتر مولوی احمد دین صاحب نے کئی ایسے مواقع کا مشاہدہ کیا۔ مجھے خود سر عبدالقادر نے بتایا کہ اقبالؔ ایک ایک وقت میں سو سو شعر کہہ چکے ہیں۔ اور اس کیفیت کے پیشِ نظر مجھ سے سر عبدالقادر نے کئی مرتبہ یہ بھی فرمایا۔ کہ چونکہ اقبالؔ کے وقت کا اکثر حصہ میرے پاس بسر ہوتا ہے۔ اس لئے میں تمام ایسے مواقع پر ان کے

اشعار و اذکار کو قلمبند کر لیا کروں۔ تاکہ یہ چیزیں محفوظ ہو جائیں۔ لیکن مجھے حد درجہ صدمہ ہے کہ میں نے شیخ صاحب کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ ورنہ کئی ایسی باتیں معرضِ نوشت میں آ جاتیں۔ جن سے اقبال کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت سی مدد ملتی۔ اقبال کی نگاہ میں اس قدر بصیرت تھی۔ کہ وہ معمولی سے معمولی واقعات سے بھی فلسفے کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتے۔ مثلاً ایک مرتبہ سر ذوالفقار علی خاں سر جوگندر سنگھ اور میں اقبال کے ساتھ نواب صاحب کی موٹر میں شالامار کی طرف سیر کو نکلے۔ اس زمانے میں موٹر سازی کی صنعت ابھی تکمیل پذیر نہ ہوئی تھی۔ اس لئے موٹریں چلنے کے دوران میں اچھا خاصہ شور پیدا کرتیں۔ مگر نواب صاحب کی موٹر چونکہ بیش قیمت تھی۔ اس لئے اس میں یہ نقص بڑی حد تک غائب تھا۔ چنانچہ سر جوگندر سنگھ نے از راہِ حیرت کہا کہ نواب صاحب کی موٹر کس قدر خاموش واقع ہوئی ہے بظاہر یہ بات کوئی ایسے پتے کی نہ تھی۔ کہ اقبال اس سے یوں متاثر ہو جاتے کہ وہ اسی فقرے پر اپنی نظم کی بنیاد رکھ دیتے۔ لیکن "بانگِ درا" میں "موٹر" کے عنوان سے جو نظم ہے۔ اس کا مطالعہ فرمائیے اور اقبال کی فلسفہ طراز طبیعت کا اندازہ لگائیے۔ غرضیکہ اقبال کے کلام میں متعدد ایسی نظمیں ملتی ہیں جو اکثر نہایت معمولی واقعات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں اگر ان واقعات کو قلمبند کر لیا جاتا۔ تو شاید ان سے بہت سی مفید باتیں نکل سکتیں۔

ڈاکٹر صاحب اپنے خاص دوستوں کی صحبت میں عموماً اپنے تازہ اشعار بلا کسی فرمائش کے خود بخود سنا دیا کرتے۔ مگر جس زمانے میں وہ "شکوہ" لکھ رہے تھے۔ انہوں نے البتہ حد درجہ خاموشی سے کام لیا۔ جس شام انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں نقیر سید افتخار الدین مرحوم کی صدارت میں آپ یہ نظم سنانے والے تھے۔ اسی شام آپ اپنے والد صاحب کے ہمراہ میرے ہاں مدعو تھے۔ ہم کھانا ختم کر رہے تھے کہ انجمن کے سیکرٹری صاحب معہ چند ارکین کے ہانپتے ہوئے تشریف لائے اور پریشانی کی عالت میں کہنے لگے۔ کہ نظم کا وقت شروع ہونے والا ہے اور سامعین شدت سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فی الفور اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم سمجھ گئے کہ اس مرتبہ کوئی معرکہ آرا

نظم ہو گی۔ جس کے لئے اس قدر پردہ داری سے کام لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب پنڈال میں داخل ہوئے تو ہمیشہ کی طرح اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں میں ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس کے بعد تائیوں کے شور میں ڈاکٹر صاحب نظم سنانے کیلئے اٹھے اور یہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ کہ جب آپ نے پڑھنا شروع کیا۔ تو جلسہ پر رقت کی کیا کیفیت طاری ہوئی۔

عام طور پر شعر سنانے کے معاملے میں ڈاکٹر صاحب حد درجہ محتاط تھے۔ انہیں اپنی طبیعت کے سوا کوئی شے اس امر کے لئے مجبور نہ کر سکتی یہی وجہ تھی۔ کہ وہ اپنے خاص دوستوں کے سوا کسی کو نظم نہ سناتے۔ البتہ حکیم محمد اجمل خاں اور نواب سر ذوالفقار علی خاں دو دوست ایسے تھے کہ ان کو یہ رعایت حاصل تھی۔ کہ ان کی فرمایش ڈاکٹر صاحب رد نہ فرماتے تھے۔ مگر وہ بھی ڈاکٹر صاحب کی طبیعت سے واقف تھے۔ اس لئے کبھی بے جا اصرار نہ کرتے۔ ایک دفعہ لاہور میں پراونشل مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے راجہ نوشاد علی تعلقہ دار اودھ تشریف لائے ہوئے تھے اور سر محمد شفیع کے ہاں قیام پذیر تھے۔ جلسہ میں اقبال، سر عبدالقادر کے ساتھ میں بھی موجود تھا۔ کارروائی سے فراغت پا کر ہم سب راجہ صاحب کے ساتھ چاء پی رہے تھے کہ راجہ صاحب نے بر سبیل تذکرہ کہا۔ کہ ہم سنا کرتے تھے کہ پنجاب کے لوگ زندہ دل ہوتے ہیں۔ مگر میں نے تو یہاں کوئی زندہ دلی نہیں دیکھی۔ شیخ صاحب نے فرمایا کہ آپ غلط جگہ پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ خیر لیجئے۔ ہم اس کا بھی انتظام کئے دیتے ہیں۔ اور انہوں نے مجھے اشارا کیا۔ کہ لو بھئی کل یہ شکایت بھی رفع ہو جائے۔ میں نے دوسرے دن رقص و سرود کا سامان کیا اور راجہ صاحب کو معہ دیگر احباب کے مدعو کیا۔ ہر چند لاہور کی نامور طوائف بلائی گئی تھیں۔ مگر لکھنؤ کا لطف کہاں ؛ تھوڑی دیر کے بعد راجہ صاحب نے گانا بند کرا دیا اور اقبال سے فرمائش کی۔ کہ وہ ترنم کے ساتھ کچھ سنائیں۔ ہر چند انہوں نے اصرار کیا۔ مگر ڈاکٹر صاحب صاف انکار کر گئے۔

اس سے جلسہ میں بدمزگی سی پیدا ہو گئی۔ جب سب لوگ اُٹھ کر چلے گئے تو ڈاکٹر صاحب مجھ سے کہنے لگے۔ "جو لوگ اپنی وجاہت کے بھروسے پر میری نظم سُننا چاہتے ہیں۔ وہ میرے سامعین میں سے نہیں"۔

جس صحبت میں سر عبدالقادر یا گرامی مرحوم ہوتے اقبال اپنی نظم کے دوران میں لطافتِ سخن اور رفعتِ تخئیل کی طرف خاص طور پر توجہ دلایا کرتے۔ گرامی مرحوم کی موجودگی میں اشعار کا خاص لُطف آتا کہ دونوں اُستادانِ فن ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے۔

اقبال دیگر اساتذہ کے شعر و سخن کے بھی بہت دلدادہ تھے۔ خواجہ حالی مرحوم کے مسدس کے تو عاشق تھے۔ میرے پاس ریاست ٹونک کا ایک شائستہ مذاق شخص ملازم تھا۔ اسے ستار بجانے میں خاصی دسترس تھی۔ اور وہ مسدس حالی ستار پر ایک خاص طرز کے ساتھ سُنایا کرتا۔ ڈاکٹر صاحب التزام کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے اس سے مسدس سُننے کی خواہش کرتے۔ حضور سرورِ کائنات کی تعریف میں وہ بند جو

"وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا"

سے شروع ہوتے ہیں یا جو مسدس حالی کے آخر میں ہیں انہیں بطور خاص مرغوب تھے۔ ان کو سُنتے ہی ان کا دل بھر آتا اور وہ اکثر بے اختیار رو پڑتے۔ اسی طرح اگر کوئی عمدہ نعت سُنائی جاتی۔ تو اُن کی آنکھیں ضرور پُرنم ہو جاتیں۔ حضورِ رسالتمآب کے ساتھ انہیں جو وابستگی تھی اسی کی وجہ سے انہیں اولیائے کرام سے بھی خاص عقیدت تھی اور وہ ان کے مزارات پر اکثر حاضر ہوا کرتے۔ لاہور میں حضرت علی ہجویریؒ اور شاہ محمد غوثؒ کے مزارات پر اکثر جاتے اور اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار فرماتے۔ وہ پیشہ ور پیروں کے ہمیشہ خلاف رہے لیکن اگر انہیں کوئی مردِ کامل نظر آ جاتا۔ تو وہ ضرور اس کی طرف متوجہ ہوتے۔ ایک مرتبہ پانی پت کے چند اشخاص نے مجھے اپنے مقدمہ میں وکیل کیا۔ یہ اصحاب حضرت خواجہ غوث علی شاہ صاحب قلندر پانی پتی کے سجادہ نشین حضرت

سیّد گل حسن شاہ صاحب مصنّف تذکرہ غوثیہ کے مُرید تھے۔ اس زمانے میں شاہ صاحب کی روحانیت کا بہت شہرہ تھا۔ میرے موکل جب لوٹنے لگے۔ تو مَیں نے شاہ صاحب کو سلام بھیجا اور کہلا بھیجا کہ کبھی پانی پت کی طرف آنے کا موقع ملا۔ تو ضرور حاضر خدمت ہونگا۔ دو تین ماہ بعد ایک دن اچانک انہیں اصحاب میں سے ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے" لو شاہ صاحب خود ہی تشریف لے آئے ہیں ان دنوں وہ امرتسر میں مقیم ہیں اگر تم ان سے ملنا چاہو تو میرے ساتھ چلو۔ میں نے شاہ صاحب کے جائے قیام کا پتہ دریافت کر کے انہیں تو رخصت کیا۔ اور خود ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچا۔ وہ بھی چلنے کو تیار ہو گئے۔ اِتنے میں سر ذوالفقار علی خاں تشریف لے آئے اور ہم تینوں ٹرین پر سوار ہو کر امرتسر پہنچے۔ راستے میں یہ طے پایا کہ شاہ صاحب پر سر اقبال اور سر ذوالفقار کی شخصیت کا اظہار نہ کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ دیکھنا مطلوب تھا۔ آیا شاہ صاحب بھی اپنے کشف سے ان کی شخصیت کو تاڑ لیتے ہیں یا نہیں، ہم شاہ صاحب کے پاس پہنچے۔ تو میرے موکلوں میں سے ایک نے میرا تعارف کرایا اور مَیں نے اپنے رفقاء کو شیخ صاحب اور خانصاحب کے مختصر ناموں کے ساتھ پیش کیا۔ دورانِ گفتگو میں شاہ صاحب نے دریافت کیا۔" آپ میں سے کوئی صاحب شعر بھی کہتے ہیں" یہ سوال اپنی تمام تر سادگی کے باوجود ہمارے لئے حد درجہ اہم تھا اس لئے نواب صاحب اور میں کنکھیوں سے اقبال کی طرف دیکھنے لگے۔ نواب صاحب نے ٹال دینے کی نیت سے جواب دیا" شاہ صاحب جہاں تک شعر سے لُطف اندوز ہونے کا تعلق ہے ہم بھی اہلِ پنجاب کی ادبی روایات کے تھوڑے بہت حامل ضرور ہیں" مگر شاہ صاحب اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے ۔ کہنے لگے۔ جس طرح پھُول کی خوشبو خود بخود انسان کے دماغ تک پہنچ جاتی ہے مجھے بھی یوں محسوس ہو رہا ہے گویا آپ میں سے کوئی صاحب شاعر ضرور ہیں اتنے میں اندر سے کسی کی آواز آئی" ارے یہ کہیں ذوالفقار تو نہیں بول رہے؟" نواب صاحب ٹپٹا گئے۔ کہ ان کا راز کیسے کھُل گیا۔ معلوم ہُوا۔ راجہ . . . . . . (نام یاد نہیں رہا) تعلقہ دار یو پی جو شاہ صاحب کے مرید اور نواب صاحب

کے دوست تھے اور اپنے علاج کے سلسلے میں اپنے پیر صاحب کے ہمراہ امرتسر آئے ہوئے تھے۔ اندر لیٹے ہیں انہوں نے نواب صاحب کی آواز فوراً پہچان لی اور نواب صاحب کا راز طشت از بام کر دیا۔ اب میرے لئے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں نے پشیمانی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا نام شاہ صاحب کو بتایا۔ ڈاکٹر صاحب کا نام سُن کر مسکرانے لگے۔ پھر بولے میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ کہ آپ میں سے یہی حضرت شاعر ہیں۔ اس کے بعد دیر تک ڈاکٹر صاحب کی نظموں کے متعلق شاہ صاحب اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہے۔ ہم چلنے کی نیت سے اُٹھنے لگے تو اقبال نے شاہ صاحب سے کہا۔ کہ وہ عرصہ سے سنگِ گروہ کے مریض ہیں۔ وہ ان کے لئے دُعا کریں کہ انہیں اس شکایت سے نجات ملے۔ شاہ صاحب کہنے لگے "بہت اچھا لیجئے میں آپ کے لئے دُعا کرتا ہوں۔ آپ بھی ہاتھ اُٹھائیں"۔ دُعا کے بعد ہم نے اجازت لی اور لاہور کی ٹرین میں سوار ہو گئے۔ راستے میں ڈاکٹر صاحب پیشاب کی نیت سے غسلخانے میں تشریف لے گئے۔ واپس آئے تو ان کے چہرے پر حیرت و استعجاب کے آثار نظر آرہے تھے کہنے لگے "عجب اتفاق ہوا ہے۔ پیشاب کے دوران میں مجھے یوں محسوس ہوا۔ گویا ایک چھوٹا سا سنگ ریزہ پیشاب کے ساتھ خارج ہو گیا ہے۔ مجھے اس کے گرنے کی آواز تک سنائی دی اور اس کے خارج ہوتے ہی طبیعت کی ساری گرانی جاتی رہی"۔

اکثر مجالس میں ڈاکٹر صاحب سے قرآن حکیم کے رموز سُننے کا بھی ہمیں موقع ملتا۔ وہ فقہ میں کسی خاص سکول کے پابند نہ تھے۔ گو عام طور پر لوگ انہیں سُنی ہی سمجھتے رہے ہیں اور وہ اپنے امور میں اہلِ سُنت ہی کے شعار کے پابند تھے۔ مسائل شرعی میں وہ بڑی آزاد خیالی کے ساتھ گفتگو فرمایا کرتے اور دورانِ بحث میں کہا کرتے خُدا کا ارشاد ہے فتفکروا و تدبّروا اجتہاد ہر شخص کا فطری حق ہے اور وہ ساری عمر اسی پر عمل پیرا رہے۔ اقبال مذہبی لٹریچر کا بہت وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ جب وہ کسی مذہبی مسئلہ پر اظہار خیال فرماتے۔ تو

معلوم ہوتا کہ موضوع زیر بحث پر کوئی کتاب یا رسالہ ان کی نظر سے نہیں بچا۔ وہ اپنے خیالات کو اس خوبی سے پیش کرتے کہ سننے والا ان کے تبحر علمی سے مرعوب ہوئے بغیر رہ نہ سکتا۔ ان کا استدلال ایسا جامع ہوتا۔ کہ مخالف پر ہر طرح کی حجت پوری ہو جاتی اور اس کے لئے انحراف کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی۔ ان کے انداز بیان میں ایک ایسی قدرت تھی کہ وہ فرسودہ سے فرسودہ مسائل میں بھی کوئی نہ کوئی نیا نکتہ پیدا کر کے دکھا دیتے اور باخبر سے باخبر سننے والے کو بھی یوں معلوم ہوتا۔ گویا یہ بات پہلے اس کے مطالعہ میں کبھی آئی نہ تھی۔ مگر اپنی اس عالمانہ شان کے باوجود اقبال کبھی تعلی کی نہ لیتے۔ میں نے انہیں کبھی اپنی وسیع معلومات سے اپنے پاس بیٹھنے والوں پر رعب ڈالتے ہوئے نہیں دیکھا۔

مجھے ابتداء سے مذہبی باتوں میں بہت توغل تھا۔ سر سیّد کی تعلیم نے تو اس تشنگی کو جنون میں تبدیل کر دیا تھا۔ چنانچہ میرے اور اقبال کے درمیان فراغت کے ایام میں اکثر مذہبی بحث چھڑ جاتی۔ بلکہ میں ان کے تبحر علمی سے مستفید ہونے کی خاطر ان سے بحث چھیڑ لیتا۔ جس کے دوران میں ان کے ساتھ آیات محکمات و متشابہات اور ولادتِ مسیح۔ ظہورِ مہدی جبر و اختیار۔ جزا و سزا وغیرہ جیسے متنازعہ مسائل پر میرا ان کے ساتھ تبادلۂ خیال ہوتا اور وہ ان مسائل کی اس شرح و بسط کے ساتھ وضاحت فرماتے کہ اگر میں ان کے آرا و افکار کو ساتھ ساتھ قلمبند کرتا رہتا۔ تو آج مذہبی مسائل پر ایک ضخیم و جامع دفتر تیار ہو جاتا۔ ڈاکٹر صاحب کی وسعتِ معلومات کو دیکھ کر مجھے کئی مرتبہ خیال گذرتا کہ اگر وہ شعر و سخن اور فلسفیانہ غور و فکر کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے مذہبی مسائل کی تشریح کی طرف توجہ دیتے تو وہ اپنے وقت کے بہت بڑے مذہبی پیشوا ہوتے، اسی خیال کے پیش نظر میں نے کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے استدعا کی۔ کہ قرآن حکیم کی تفسیر لکھیں اور اس میں کلام نہیں کہ اگر وہ تفسیر لکھتے۔ تو وہ یقیناً بہترین ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں علوم اسلامی کی نشر و اشاعت کا خیال ہمیشہ رہا۔ وہ مجھ سے فرمایا کرتے کہ اگر حالات ساعدت کرتے تو وہ ایک اسلامی دار الاشاعت کی طرح ڈالتے۔ جو اسلامی فلسفہ و تعلیم کو دُنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانے کی سعی کرتا۔ وہ کہا کرتے کہ علوم اسلامی کے متعدد اوراق ایسے ہیں۔ جن کی اشاعت اس زمانے کے لئے ازلیں ضروری ہے انہوں نے کئی مرتبہ ایک ایسی اسلامی لائبریری کی ضرورت کو بھی شدت سے محسوس کیا۔ جہاں مذہب کے متعلق تمام ضروری کتابیں مہیا ہوں ۔ اسی طرح وہ ایک ایسے اسلامی ادارے کے قیام کے بھی خواہشمند تھے۔ جس کے توسط سے علومِ اسلامی کا احیا ہو۔ ... انہوں نے کئی مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ اگر کہیں سے زمین اور اخراجات کا انتظام ہو سکتا۔ تو وہ اپنی دیرینہ آرزو کو عملی شکل دیتے۔ ملاؤں کے طائفہ نے اسلامی ترقی کو ہندوستان میں جس قدر ضعف پہنچایا ہے۔ اس پر ان کا دل ہمیشہ جلتا.... وہ ان کی سرگرمیوں کی روک تھام کے لئے اپنے ذہن میں ایک سکیم تیار کر رہے تھے۔ بلکہ آخری دنوں میں انہوں نے اعلیحضرت سرکار بہاولپور کی خدمت میں اسی سکیم کے بارے میں ایک خط بھی ارسال کیا۔ ان کے اس ارادے کی تجویز نے خود مجھ پر اس قدر اثر کیا۔ کہ مَیں نے بہاولپور میں اس کی سرپرستی کا انتظام کرنا چاہا۔ بلکہ بہاول نگر کے گرد و نواح کو اس کام کے لئے اپنے ذہن میں منتخب بھی کر لیا۔ جن دنوں وہ بیمار تھے۔ مَیں کرنل مقبول حسین قریشی وزیر بہاولپور کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچا اور میں نے انہیں بتلایا کہ مَیں کرنل موصوف کے توسط سے سرکار بہاولپور کی خدمت میں ان کے ادارے کی سرپرستی کے لئے درخواست کرنے والا ہوں۔ اس خبر سے وہ بہت خوش ہوئے۔ مگر ان کی بے وقت موت نے اس کام کو وہیں روک دیا۔

معاشرتی بحثوں میں وہ ہمیشہ سادہ زندگی اختیار کرنے کی تلقین فرمایا کرتے بلکہ حضورِ رسالتمآب کی سادہ زندگی کو اپنا اسلوب بنانا چاہتے۔ جب وہ میری درخواست پر انارکلی سے میکلوڈ روڈ پر اٹھ آئے تو مَیں

نے ان سے مکان کی آرائش کے لئے کہا۔ کہ وہ اس کے مردانہ کمروں کو ڈرائنگ اور ڈائننگ کی صورت میں تقسیم کر دیں۔ مگر اس پر انہوں نے یہی فرمایا کہ وہ کسی قسم کے بے معنی تکلفات میں اُلجھنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ کوٹھی میں رہائش اختیار کرنے کے باوجود انہوں نے اپنا معاشرتی اسلوب وہی رکھا جو انارکلی بازار کے قیام کے دوران میں تھا۔ انہوں نے کبھی اپنے کمروں کو مغربی فیشن کے مطابق آراستہ نہ کیا۔ بلکہ اس میں ایک خاص انداز پیش نظر رکھتے۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کے نشست کے کمرے کی کیفیت یہ تھی۔ کہ فرش پر قالین بچھا رہتا اور کرسیاں دیوار کے ساتھ چاروں طرف لگی رہتیں۔ ڈاکٹر صاحب خود فرش پر تشریف رکھتے اور ملاقاتی بھی اکثر فرش ہی پر بیٹھتے۔ کمرہ میں داخل ہونے سے قبل ایک برآمدہ تھا۔ جس میں کرسیاں بچھی رہتیں۔ ایام سرما میں ڈاکٹر صاحب دھوپ میں بیٹھنے کی نیت سے برآمدہ میں تشریف رکھتے۔ برآمدہ کے ایک طرف ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جسمیں ایک چارپائی پڑی رہتی۔ گرمی کے دنوں میں آپ دن کے وقت اسی کمرے میں آرام فرماتے۔ اس سادہ پسندی کی وجہ سے انہیں غیر ملکی لباس سے نفرت تھی۔ گو ہائیکورٹ میں انہیں کوٹ پتلون پہن کر جانا پڑتا اور اکثر معاشرتی تقریبات کے سلسلے میں بھی وہ انگریزی لباس ہی بہ مجبوری تمام پہن لیا کرتے۔ لیکن موجب تکلف سمجھ کر وہ ہمیشہ اسے بارِ خاطر سمجھتے رہے۔ وہ اکثر شلوار اور چھوٹا کوٹ پہنتے۔ عیدین کی نماز کے موقع پر کبھی کبھی بند گلے کا کوٹ بھی پہن لیا کرتے۔ اسی طرح وہ دیسی جوتی اور رُومی ٹوپی کو پسند کرتے۔ کبھی کبھی صافہ بھی باندھ لیتے۔ دیسی کھانے میں وہ اچھی چیزیں بڑی رغبت سے کھاتے۔ بلکہ اچھا کھانا کھانے کا انہیں بہت شوق تھا۔ پہلے تو دن میں وہ دو مرتبہ ہی کھانا کھایا کرتے تھے۔ بعد میں ایک وقت پہ اکتفا کرنے لگے۔ اس میں بھی حتی الوسع کم کھاتے۔ اس سلسلہ میں میں نے ڈاکٹر صاحب میں ایک عجیب بات دیکھی اور وہ یہ کہ جب بھی وہ کھانے کے وقت پر میرے ہاں ہوتے اور میں ان سے دریافت کرتا کہ اگر اشتہا ہو تو کھانا منگواؤں۔ تو یہی

جواب دیتے کہ انہوں نے کبھی اشتہاء سے کھانا نہیں کھایا۔ بلکہ جب بھی مل جائے۔ کھا لیا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب حُقّے کے بہت دلدادہ تھے۔ خالص پنجابی قسم کا حقّہ ہر وقت ان کے سامنے پڑا رہتا

ایک مرتبہ شہزادی دلیپ سنگھ بمبا کی کوٹھی پر جانے کا اتفاق ہوا۔ سر جوگندر سنگھ، سر ذوالفقار علی خاں اور میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ تھے موصوفہ کو ڈاکٹر صاحب سے بہت عقیدت تھی اور وہ ہمیں اکثر اپنی کوٹھی پر مدعو کیا کرتیں۔ ہم سب بیٹھ گئے تو شاہزادی اٹھ کر برآمدہ میں تشریف لے گئیں اور چند منٹ بعد ایک نفیس حقّہ خود اُٹھائے ہوئے واپس آئیں اور ڈاکٹر صاحب کے سامنے اسے رکھ کر فرمایا کہ شوق کیجئے۔ شہزادی اُردو نہ جانتی تھیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے کلام کی بہت مشتاق رہتیں۔ ان کی فرمائش پر ڈاکٹر صاحب نے ایک مختصر سی نظم سُنائی۔ جس کا ترجمہ سر جوگندر سنگھ نے انگریزی میں کیا۔

اقبال جہاں کہیں بھی رہے ان کا مکان مرجع خواص و عوام رہا۔ کیونکہ ان کی محفل میں ہر ایک کو صلائے عام تھی۔ صبح سے شام تک ملاقاتیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ان کے مکان پر جاری رہتا اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہ سارا دن اپنے مکان پر مقیم رہنے کے عادی ہو گئے اور چلنے پھرنے سے گھبرانے لگے۔ جب وہ انار کلی میں قیام پذیر تھے۔ تو صبح کے وقت چند دوستوں کی معیت میں وہ بھاٹی دروازہ کی طرف سے راوی کی جانب جایا کرتے۔ جب وہ میکلوڈ روڈ پر آئے تو میں نے ان سے کہا کہ وہ صبح کے وقت سیر کو نکلا کریں۔ چند روز تو وہ میرے ساتھ گئے۔ ایک دن تنگ آ کر کہنے لگے۔ کہ "یہ روز کا جھنجھٹ کچھ ٹھیک نہیں۔ کبھی کبھار چلنا ہوا کرے تو ایک بات بھی ہے ہر روز کون نکلے"۔

ڈاکٹر صاحب کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ جو تھوڑا سا وقت دوست احباب اور ملاقاتیوں کی صحبتوں سے بچ رہتا اسے مطالعہ پر صرف کرتے۔ مطالعہ کے لئے خاص مضمون یا خاص زبان کا التزام نہ ہوتا۔ اُردو۔ فارسی

عربی انگریزی جس زبان کی کتاب مل جاتی پڑھ لیتے۔ اچھی کتاب کا نام سُنتے تو دوستوں سے مانگ لیتے۔ اپنی کتابوں میں جس میں زیادہ دلچسپی لیتے۔ اِس کے حاشیے پر بطور نوٹ کچھ نشان سے بھی لگا دیا کرتے۔ انگریزی تلفظ میں ڈاکٹر صاحب کا لہجہ بڑا معمولی تھا۔ مگر تحریر میں ان کے قلم کا زور بے پناہ ہوتا۔ یہی حال عربی فارسی کا تھا۔ ۔۔۔ ان زبانوں پہ عالمانہ عبور رکھنے کے باوجود بولنے میں ان کی کیفیت یہ ہوتی۔ کہ وہ اٹک اٹک جاتے مطالب قرآنی پر ان کی نظر ہمیشہ رہتی۔ کلام پاک کو پڑھتے تو اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے۔ بلکہ نماز کے دوران میں جب وہ باآواز بلند پڑھتے تو وہ آیاتِ قرآنی پہ فکر کرتے اور ان سے متاثر ہو کر رو پڑتے۔ ڈاکٹر صاحب کی آواز میں ایک خاص کشش تھی۔ جب وہ قرآنِ پاک کو باآواز بلند پڑھتے یا اپنے اشعار اپنی مخصوص لے میں سُناتے۔ تو سُننے والوں کا دل پگھل جاتا۔ جب ان کی آواز خراب ہو گئی۔ تو میں اُن سے ملنے گیا۔ مجھے اُنکی اس شکایت کا علم نہ تھا۔ دورانِ گفتگو میں نے دیکھا کہ وہ بہت زور سے بولنے کی کوشش کرتے پھر بھی اُن کی آواز ٹھیک طور پر سُنائی نہ دیتی۔ اس کیفیت کو دیکھ کر میرے دل پر سخت چوٹ لگی اور میں نے بحالت یاس اُن سے کہا۔ کہ "ڈاکٹر صاحب آپ کی آواز کا یوں بند ہو جانا آپ سے بڑھ کر خود آپ کے دوستوں کی بدقسمتی ہے۔ جن کے گوش اب اس نعمت سے نہ جانے کب تک محروم رہیں"۔

ڈاکٹر صاحب کو روپے پیسے کا لالچ نہ تھا۔ ہاں اس کی قدر ضرور کرتے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ وہ اس کے بے ضرورت خرچ سے ہمیشہ محترز رہتے بلکہ اکثر اوقات اس کے مصرف میں اس قدر حزم و احتیاط سے کام لیتے کہ ان کی احتیاط کنجوسی دکھائی دینے لگتی۔ ہم نے کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب کو مشورہ دیا۔ کہ وہ کبھی کبھی کھانے پر حکام کو اپنے ہاں مدعو کر لیا کریں۔ انگریز کو رام کرنے کا بہترین طریقہ اکل و شرب کی دعوت ہے۔ وہ اکثر بڑے بڑے عہدے ایسی ہی صحبتوں میں کیا کرتا ہے اور جو تعلقات کھانے کی میز پہ قائم ہوتے ہیں۔ ان کا احترام

اسے ہمیشہ ملحوظ رہتا ہے مگر ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ہمارے مشورے قابلِ قبول نہ ہوتے وہ یہی جواب دیتے کہ وہ ایسی تقریبات پر روپیہ ضائع کرنا پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ اول تو انگریز کو رام کرنے کا سوال ہی ان کی دلچسپیوں کے دائرہ سے باہر تھا۔ دوسرے اگر کھانا کھانے کے بعد بھی انگریز رام نہ ہُوا۔ تو اس دردِ سر کا فائدہ؟

ڈاکٹر صاحب نے خود کبھی کسی دنیوی اعزاز کے حصول کے لئے کوشش نہیں کی۔ گو جب وہ کسی سے سُن پاتے کہ ان کا نام ہائیکورٹ کی ججی کے لئے زیرِ غور ہے تو وہ اس موضوع پر خاص طور پر دلچسپی لینا شروع کر دیتے۔ مگر وہ خود اس سلسلے میں کبھی کوئی سرگرمی نہ دکھاتے۔ بلکہ انہوں نے اپنے خطاب کے معاملہ میں بھی کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں فرمایا۔ خطاب کے ملنے سے کچھ عرصہ پیشتر انگلستان کا ایک مشہور اخبار نویس جو ادبی دُنیا میں کافی شہرت رکھتا تھا۔ ممالکِ اسلامی کی سیر سیاحت کے بعد افغانستان کی طرف سے ہندوستان میں داخل ہُوا اور گورنر پنجاب کا مہمان ہُوا۔ اسے ترکی سے لے کر افغانستان تک جس اسلامی قلمرو سے گذرنے کا اتفاق ہُوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا نام ہر جگہ اس کے سُننے میں آیا تھا۔ لاہور پہنچتے ہی اس نے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر اربابِ حکومت چونکہ ہمارے ادبی مشاہیر سے بے خبر اور ان کے کارناموں سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ اس لئے کچھ تعجب نہیں۔ اگر گورنر پنجاب اقبال کی عظمت سے ناواقف نکلے۔ تاہم اخبار نویس نے انہیں مجبور کیا۔ کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو گورنمنٹ ہاؤس میں چاء پر مدعو کر کے اسے ان کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع بہم پہنچائے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کو گورنمنٹ ہاؤس میں تشریف لانے کی دعوت دی گئی۔ مگر ان کی مثال تو زمین جنبد نہ جنبد گُل محمدؐ کی سی تھی۔ کہنے لگے "کون جائے۔ پاؤں کے انگوٹھے میں کئی دن سے درد ہے۔ گورنمنٹ ہاؤس تک جانے میں نہ جانے تکلیف کس قدر بڑھ جائے"۔ میں نے اصرار کیا کہ وہ ضرور جائیں۔ پہلے تو وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ مگر بعد میں چلنے کے لئے تیار ہو گئے اور میں انہیں اپنی گاڑی میں سوار کر کے خود گورنمنٹ ہاؤس تک

پہنچا کر آیا۔ واپسی پر وہ سیدھے میرے ہاں تشریف لائے اور متذکرہ بالا واقعہ من وعن سنایا۔ اس کے چند دن بعد ہی گورنمنٹ کی طرف سے آپ کے روبرو خان بہادر کے خطاب کی تجویز پیش کی گئی۔ جسے آپ نے ٹھکرا دیا اس کے بعد "شمس العلماء" کی تجویز ہوئی۔ اسے بھی آپ نے رد کر دیا۔ بالآخر "نائٹ ہڈ" کی تجویز ہوئی۔ اس کے قبول کرنے میں بھی آپ کو تامل تھا۔ لیکن نواب سر ذوالفقار علی خاں کے اصرار پر وہ اس پر رضامند ہو گئے جب انہوں نے خطاب قبول کر لیا۔ تو اس پر دبی زبان سے چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کسی نے کہا "حکومت نے آپ کی زبان بندی کے لئے یہ چال چلی ہے" کوئی کہنے لگا "آخر بیچارے اقبال بھی کیا کرتے۔ حصولِ جاہ سے بے نیاز رہنا کچھ اتنا آسان نہیں"۔ کسی اور نے کہا۔ "نہیں اب اقبال کی فطری بے باکی کا خاتمہ سمجھو"۔ انہیں خیالات کی ترجمانی میں "زمیندار" میں مولانا ظفر علی خاں صاحب نے ایک نظم بھی چھاپ ماری۔ ڈاکٹر صاحب بھی عوام کی اس قیاس آرائی سے بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ جب اس خطاب کے سلسلے میں آپ کے اعزاز میں شاہدرہ باغ کے اندر ایک بہت بڑی پارٹی دی گئی۔ تو آپ نے گورنر پنجاب کی موجودگی میں وہ اشعار سنائے جو "طلوعِ اسلام" کے ابتداء میں درج ہیں۔ اس میں انہوں نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کو اعلائے کلمۃ الحق سے نہیں روک سکتی۔

حساس ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں عفو اور غیظ دونوں قسم کے جذبات کی شدت تھی وہ زود رنج تو نہ تھے۔ لیکن اگر ناراض ہو جاتے تو پھر ان کا غصہ دیر تک رفع نہ ہوتا۔ اسی طرح جب مائل بکرم ہوتے تو بڑی سے بڑی رنجش کی بھی پرواہ نہ کرتے۔ مجھے خود ان کی طبیعت کی اس افتاد کا ایک تجربہ حاصل ہے نواب سر ذوالفقار علی خاں مرحوم اور میرے درمیان چند قطعات اراضی کے نظم ونسق کے سلسلے میں ایک غلط فہمی سی پیدا ہو گئی۔ بظاہر یہ بڑی معمولی سی غلط فہمی تھی۔ جس کا ازالہ معمولی حالات میں بآسانی ہو جاتا۔ مگر اتفاقات ہی

کچھ ایسے پیش آئے۔ کہ یہ ذراسی غلط فہمی اچھی خاصی رنجش میں مبدل ہوگئی۔ ایک دن بر سبیل ذکر ڈاکٹر صاحب کے مکان پر یہی مسئلہ ہم دونوں کے درمیان زیر بحث آگیا۔ میں نے ان کے پاس اپنی صفائی پیش کی اور ان سے کہا کہ میں ان کے روبرو تمام واقعات کو پیش کروں گا۔ تاکہ وہ ہم دونوں کے دوست کی حیثیت سے غیر جانبداری سے بتا سکیں۔ کہ میری طرف سے یا نواب صاحب کی طرف سے کون سی زیادتی روا رکھی گئی تھی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ "میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ نواب صاحب راستی پر ہیں" مجھے ڈاکٹر صاحب کے اس یک طرفہ فیصلہ پر سخت رنج ہوا اور میں نے کہا "اگر آپ نے حالات کو سننے بغیر میرے متعلق اپنے دل میں ایک رائے قائم کر لی ہے۔ تو میں آپ کی اس غیر منصفانہ رائے کو پرکاہ کی وقعت بھی نہیں دیتا" اتنا کہہ کر میں چھڑی اٹھا کر باہر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ گو اس وقت میرا دل غصے کے جذبات سے معمور تھا۔ پھر بھی اپنی پرانی دوستی کے پیش نظر مجھے یہی توقع تھی۔ کہ وہ مجھے اس طرح رخصت ہونے نہ دیں گے۔ بلکہ آگے بڑھنے سے روک دینگے۔ مگر التجاو منت سے ڈاکٹر صاحب کی طبیعت بیگانہ تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھے حقہ گڑگڑاتے رہے۔ گویا ان کے نزدیک میرا یہ اضطراری فعل میرے روزمرہ کے معمول میں سے تھا۔ اس سے میرے دل پر ایک اور چرکا لگا اور میں نے یوں سمجھا۔ گویا انہوں نے دانستہ طور پر مجھے ذلیل کیا ہے گھر آیا تو میرا دل اس واقعہ سے سخت پژمردہ ہوا۔ برسوں کی یکجائی اور ہم صحبتی کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب کا میری طبیعت سے یوں بیگانہ نکلنا میرے لئے حد درجہ حیرت خیز امر تھا۔ جس کا خیال رہ رہ کر جی کو بے چین کرتا۔ نواب صاحب سے تو رنجش پیدا ہو ہی گئی تھی۔ اس واقعہ کے بعد سے ڈاکٹر صاحب سے بھی تعلقات منقطع ہو گئے۔ اس سے مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ گویا دنیا میں میں اکیلا ہی رہ گیا ہوں۔ کچہری کے کام کے بعد وقت کا کاٹنا سوہان روح ہو جاتا اور طبیعت مضمحل ہونے لگتی۔ کئی مرتبہ دل میں خیال آتا کہ جو کچھ ہوا ہے اسے عبث سمجھ کر خود ڈاکٹر صاحب کی طرف رجوع کروں۔ مگر پھر احساس خود پرستی

ایسا کرنے سے روکتا اور دل کی گہرائیوں سے ندا آتی۔ کہ اگر اقبال کو تیری دوستی کی قدر ہوتی۔ تو کیا وہ خود چل کر آنہ سکتا تھا۔ کئی مرتبہ ہائی کورٹ جاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے مکان کے سامنے سے گذرتا تو وہ مجھے دُور اپنی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے نظر آتے۔ دل میں ایک کپکپی سی ہونے لگتی اور جی چاہتا کہ دوڑ کر ان سے لپٹ جاؤں۔ مگر پھر اپنے صدمے کا خیال آجاتا اور میں خاموشی سے آگے بڑھ جاتا۔ اس کیفیت سے آہستہ آہستہ میرے مزاج میں بھی ایک قسم کی بے نیازی سی آتی گئی۔ یہاں تک کہ اسی حالت کو ایک سال گذر گیا۔ ایک سال جو اپنی طوالت کے لحاظ سے ایک صدی سے بھی طویل معلوم ہوتا تھا۔ اس اثناء میں میری بیوی کا انتقال ہوگیا۔ اس زمانے میں میں نکلسن روڈ پر اُٹھ آیا تھا۔ ایک دن صبح کے وقت دیکھتا ہوں۔ تو ڈاکٹر صاحب خراماں خراماں میرے ہاں چلے آتے ہیں۔ میں سمجھ گیا۔ کہ وہ تعزیت کی غرض سے تشریف لائے ہیں۔ مگر خدا جانے کیا وجہ تھی کہ مجھے اُن کا یوں چلے آنا کچھ ناگوار سا گذرا۔ وہ بھی میرے دل کی کیفیت کو بھانپ گئے۔ مگر خاموش رہے۔ دُعائے فاتحہ ہو چکی تو مجھے خیال گذرا شاید وہ سرد مہری سے متاثر ہو کر چلے جائیں۔ مگر وہ بدستور بیٹھے رہے۔ پھر یک لخت ایک ایسے لہجہ میں جو اُن کی رقیق القلبی کی تمام کیفیات کا آئینہ دار تھا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ "سنو تو! تم نے اس دن میرے متعلق خواہ مخواہ اپنے دل میں بدظنی کو راہ دی۔ میں نے جو کچھ کہا اس سے کسی طرح تمہاری نیت پر شُبہ کرنا مقصُود نہ تھا۔ مگر تم نے بھی غضب کر دیا۔ کہ بگڑ کر اُٹھ آئے اور پھر اس پر یہ ستم بھی روا رکھا کہ سال بھر سے اُدھر کا رُخ نہ کیا۔ مگر خیر آج اپنے دل کو میری طرف سے صاف کر دو اور میری رفاقت پر پہلا سا اعتماد پیدا کرو۔ اگر تم سچ مُچ یہی سمجھتے ہو کہ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی روا رکھی ہے تو آؤ مجھے معاف کر دو"۔ ڈاکٹر صاحب کے ان الفاظ نے میرے دل پر تو جو اثر کیا۔ وہ تو کیا ہی تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا اپنا دل بھی بھر آیا اور ہم دونوں ایک دُوسرے سے لپٹ کر بچوں کی طرح رو پڑے۔

اس واقعے سے کچھ عرصہ پیشتر۔ میرے اور نواب سر ذوالفقار علی خاں کے تعلقات بھی پھر استوار ہو چکے تھے۔ لیکن مجھے یہ معلوم کر کے حد درجہ صدمہ ہوا کہ اس دوران میں خود غرض افراد کی مساعی سے نواب صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان بھی رنجش پیدا ہو گئی تھی اور ان کے مراسم بھی منقطع ہو گئے تھے۔ اقبال اور ذوالفقار کی دوستی کچھ ایسے سطحی تعلقات پر مبنی نہ تھی۔ کہ اس کا انقطاع ایک معمولی واقعہ سمجھا جاتا۔ نواب صاحب کو ڈاکٹر صاحب سے جس قدر تعلق تھا وہ اس امر سے ظاہر ہے کہ سب سے اول آپ ہی نے انگریزی میں ڈاکٹر صاحب کے کمالات پر کتاب تصنیف فرمائی۔ اقبال کے حاسد ہمیشہ ان کے خیالات کو حکام کی نظر میں خطرناک ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔ چونکہ اس قسم کی غلط فہمیاں ڈاکٹر صاحب کی ترقی میں حارج ہو سکتی تھیں۔ اس لئے سر ذوالفقار علی ہمیشہ ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے۔ کیونکہ ان کا ایمان تھا۔ کہ اقبال اپنی تمام تر قابلیتوں کی وجہ سے اس امر کے مستحق ہیں کہ حکومت کی طرف سے ان کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ عدالت عالیہ کی بنچ کو زینت بخشیں۔ لیکن خود غرض افراد نے ان دوستوں کے درمیان بھی اختلاف کی خلیج حائل کر دی۔ مجھے اس امر کی اطلاع ملی تو میں نے ان دونوں میں صفائی کرا دینے کی کوشش کی۔ نواب صاحب تو فی الفور اس کام کے لئے آمادہ ہو گئے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں کچھ حجاب باقی تھا وہ اپنی ضد پر پہلے تو اڑے رہے۔ مگر میں نے اصرار کیا۔ تو ان کی طبیعت نے جوش مارا اور وہ مصالحت کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے ان کی صفائی کے لئے ایک تاریخ مقرر کی اور دونوں کو چاء پر اپنے ہاں مدعو کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر اس تاریخ سے قبل نواب صاحب اچانک بیمار ہو گئے اور ان کی علالت نے ایسی مہلک صورت اختیار کی کہ اسی سے ان کا انتقال ہو گیا۔ اس المناک سانحہ سے ہم دوستوں کے جی پر جو کچھ گذری وہ محتاج بیان نہیں۔ مجھے جہاں تمام عمر اس بات کا غم رہیگا کہ دونوں دوست پھر ایک دوسرے کے دل سے اس قدر قریب ہو جانے

کے باوجود آخری مرتبہ بغل گیر نہ ہو سکے۔ وہاں ڈاکٹر صاحب بھی ہمیشہ اس خیال سے مغموم ہو جایا کرتے۔ کہ دلوں کے صاف ہو جانے کے باوجود ان کو موقع نہ مل سکا۔ کہ وہ اپنے دوست کے ساتھ کم از کم ایک مرتبہ بالمشافہ گفتگو کر لیتے۔ ڈاکٹر صاحب کا ارادہ تھا۔ کہ وہ نواب صاحب کی نماز جنازہ میں ضرور شامل ہوں چنانچہ ہم دونوں موٹر میں سوار ہو کر مالیر کوٹلہ پہنچے۔ مگر بدقسمتی سے میت کو ہمارے پہنچنے سے قبل سپرد خاک کر دیا جا چکا تھا۔ ناچار ہم بادلِ حسرت زدہ فاتحہ کے بعد لاہور واپس آ گئے۔

جس شخص کو ذرا نمود حاصل ہوتی ہے۔ اس کے متعلق اکثر دو گروہ پیدا ہو جاتے ہیں ایک اس کے اتقا اور پرہیز کا دعویدار ہوتا ہے۔ دوسرا اس کی لغزشوں کو نمایاں کر کے اس کو متہم کرتا ہے۔ پہلی قسم کے لوگ حال ہی کی پیداوار ہیں۔ دوسرا گروہ ڈاکٹر صاحب کے ایام جوانی سے چلا آتا ہے۔

اقبال آخر انسان تھے۔ پیغمبرانہ اعجاز رکھنے کے باوجود پیغمبر نہ تھے۔ اس لئے ان کو ایسی باتوں سے معرّا سمجھنا جو بشریت کا لازمہ اور انسانیت کا خاصہ ہیں۔ ایک ایسا تمسخر انگیز دعوےٰ ہے۔ جس میں نہ تو حقیقت کو دخل ہے نہ خود ڈاکٹر صاحب کی روح کے لئے مسرت کا سامان موجود ہے۔ اقبال زاہد خشک تھے۔ نہ ریاکار صوفی۔ اس میں شک نہیں کہ آخری ایام میں وہ گوشہ نشینی اور درویشانہ زندگی کی وجہ سے دُنیا اور اس کے افراد سے بڑی حد تک کنارہ کش ہو گئے تھے۔ اور ان کی کیفیت اس مرد فقیر کی سی تھی۔ جو اس مادی دنیا سے بے نیاز ہو کر کسی اور ہی عالم میں کھویا رہتا ہو۔ لیکن ان کے چہرے پر تقدس کا جو ہالہ ہر وقت نظر آتا تھا۔ اس سے یہ کسی طور پر لازم نہیں آتا۔ کہ انہیں ان کے اصلی مرتبے سے محروم کر کے صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے زمرے میں شامل کر لیا جائے حالانکہ ان سے علیحدہ رہ کر بھی اقبال کے عظمت و وقار میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔

دوسرا گروہ بھی اپنی بے خبری اور تنگ نظری کے نتیجے میں ڈاکٹر صاحب پر الزمات کی بوچھاڑ کرتا ہے اس میں کلام نہیں کہ عالمِ شباب میں عام طرزِ معاشرت کے خلاف تھوڑی سی بے راہ روی ضرور موجود تھی۔ لیکن محض اسی کے پیشِ نظر کوئی حتمی نظریہ قائم کرنا ان پر بہت بڑا ظلم ہے ہر Genius کی زندگی کا جائزہ لیتے وقت ہمیں اس امر کو نظرانداز نہ کرنا چاہیئے۔ کہ عام لوگوں سے اپنے استعداد اور ادراک میں مختلف ہونے کی وجہ سے فطری طور پر وہ اپنے اصول اور میلانات میں بھی عوام سے مختلف ہوتا ہے اور اس کے ہر فعل کو ایک خاص مقررہ اصول ایک خاص مجوزہ ضابطے سے پرکھنا ستم ظریفی ہے وہ اپنے ہم جنسوں سے مختلف ہونے کی وجہ سے یقیناً مختلف معیارِ نقد کا مستحق ہے۔

اقبال کی دنیا فطرتاً اصول پرستی سے بے نیاز تھی۔ وہ عمل کا تعلق دل سے نہیں بلکہ رُوح سے سمجھتے تھے وہ یہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے کہ انسان کیا کرتا ہے یا اس کو کیا کرنا چاہیئے۔ بلکہ ان کی نظر اس کے ایقان و اعتقاد پر ہوتی یہی وجہ تھی۔ کہ اس امر کو ضروری نہ سمجھتے۔ کہ ان کا طرزِ عمل ضرور ان کے اپنے فرمودات یا معاشرہ کے مصنوعی اصولوں کے مصداق ہی ٹھہرے۔ وہ ترغیبات سے خائف سادھوؤں اور راہبوں کے خلاف زندگی کے تمام زہرناک نشیب و فراز کا لطف اُٹھانا اپنے نفس کی تکمیل کے لئے ضروری سمجھتے تھے اُن کے نزدیک زندگی نہ تو شباب کے نشہ میں اس مدہوش نوجوان کی طرح محض نقدِ عیش تھی۔ جو اپنی ہوس پرستی میں غرق ہو کر اس کی ہلاکت آفرینیوں پر سنگیں غور و فکر سے کام نہیں لیتا۔ اور نہ اس گمراہ کی طرح مذہب و معاشرہ سے بغاوت تھی۔ جو انہیں اپنے راستے میں حائل دیکھ کر ان دونوں سے بگڑ بیٹھتا ہے۔ بلکہ ان کی آزادہ روی اس صاحبِ دل کی سی تھی۔ جو زندگی کے تمام مخالف عناصر سے مردانہ وار جنگ کرتا ہوُا اس کے ہلاکت خیز طُوفانوں میں اپنے تجربات سے جادۂ مستقیم تلاش کر لیتا ہے۔

میرے ہاں اکثر شام کے وقت محفلِ رقص و سرود قائم ہُوا کرتی۔ جس میں چند ہم خیال دوست شریک ہو جایا کرتے۔ سارا دن عدالتوں میں موشگافیوں میں بسر ہو جاتا۔ رات کے وقت دیر گئے تک مقدمات کی تیاری کے مشاغل درپیش رہتے اور دن چڑھتے ہی از سرِ نو اسی دماغی کاوش میں اُلجھنا پڑتا۔ اس مسلسل انہماک سے قوار مضمحل ہو جاتے اور دماغ کے نچڑ جانے سے رُوح پر افسردگی سی چھانے لگتی۔ چنانچہ طبیعت میں تازہ دم ہونے کی خواہش پیدا ہوتی اور دل فراغت کے لمحات کے لئے بے چین ہو جاتا۔ اس پر ہم چند دوست زندگی کے پریشان کرنے والے ہنگاموں سے ہٹ کر خوش وقتی کے لئے ایک مختصر سی بزم قائم کرتے اور اس کی دلکشیوں میں اپنے تھکے ہُوئے دماغوں کو تازہ دم کرتے۔ جب اقبالؔ سے میری ملاقات ہُوئی۔ تو ان پر بھی اس مجلس کا حال کھُلا۔ ادھر میں نے بھی مولوی احمد دین مرحوم سے ان کی داستان سُن رکھی تھی۔ دونوں طرف سے کشش ہُوئی اور پہلی ہی صحبت میں ہم سمجھ گئے۔ کہ ہمارے طبائع اور مزاجوں میں ایک حیرت انگیز یکسانیت ہے جب طبیعتوں میں موافقت ہو جائے تو دوستوں کی صحبت زیادہ پُر لطف ہو جاتی۔ اور انہیں ایک دوسرے کی رفاقت میں خاص لذت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ اقبالؔ کی شمولیت کے بعد ان صحبتوں کی تعداد اور دلکشی میں ایک گونہ اضافہ ہو گیا۔

گو اقبالؔ کا کلام اکثر پچھلی شب کے سکون اور تنہائی میں مرتب ہوتا تھا۔ مگر ایسی حالت بھی ہوتی کہ ان مجالس میں ان کی طبیعت کبھی کبھی موزوں ہو جاتی اور وہ شعر کہنا شروع کر دیتے ایسا تو اکثر ہوتا۔ کہ ڈاکٹر صاحب بے فکری کے عالم میں مزے لے لیکر گانا سُننے میں مشغول ہوتے اور مغنیہ کوئی نعت چھیڑ دیتی۔ جس کا کوئی شعر ان کے دل پر اثر کر جاتا اور ان پر بے اختیار رقت طاری ہو جاتی۔ اس کیفیت کے ظاہر ہوتے ہی محفل کا نقشہ بدل جاتا اور ہمیں اس حقیقی اقبالؔ کی جھلک دکھائی دینے لگتی۔ جس کا دماغ حریمِ ربانی کے جلووں سے

مدہوش جس کا دل تجلیاتِ خداوندی سے منور جس کی نگاہ میں پیغمبرانہ پاکیزگی اور جس کے تخیل میں ملکوتی بلندی تھی۔ یہی وہ مقدس ساعت ہوتی جس میں شاعرِ مشرق خاکدانِ عالم سے بلند ہوتا ہوا عرش معلیٰ کی طرف بڑھتا اور جذبات کی تند و تیز موجیں اس کے دل کے مخفی چشمہ سے موسیقیت کے ساتھ شعر کی صورت میں اُٹھنے لگتیں۔

بعض اوقات اقبال پر ایک معنی خیز سکوت سا چھا جاتا اور وہ یوں دکھائی دینے لگتے گویا کسی اور ہی دُنیا میں چلے گئے ہیں۔ پھر وہ یک لخت یُوں چونک پڑتے گویا نیند سے بیدار ہوئے ہیں۔ اس حالت کے ظاہر ہوتے ہی ہم سمجھ جاتے کہ ان کے دل پر کوئی وجدانی کیفیت طاری ہے اور وہ شعر کی فکر میں ہیں۔ یہ کئی مرتبہ میرے مشاہدے میں آیا کہ جب اقبال کا دل کسی جذبے سے متاثر ہوتا۔ تو وہ گردو پیش کے حالات سے بالکل بے خبر ہو جاتے۔ علی برادران کی رہائی میں امرتسر میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں مولانا محمد علیؒ خود تشریف لانے والے تھے۔ اس جلسہ میں شمولیت کے لئے ہمیں بھی دعوت دی گئی اور نواب سر ذوالفقار علی خاں اقبال اور میں نواب صاحب مرحوم کی موٹر میں امرتسر کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں ہم باتیں کرتے جا رہے تھے کہ اچانک اقبال پر متذکرہ کیفیت طاری ہونے لگی۔ انہیں خاموش پا کر نواب صاحب نے ان کی جانب دیکھا۔ تو وہ کسی اور ہی دُھن میں نظر آئے اس پر وہ مجھ سے کہنے لگے "لو بھئی یہاں تو فکرِ شعر ہو رہی ہے"۔ اور ہم پھر اپنی گفتگو میں مشغول ہو گئے چند ساعت بعد اقبالؒ چونکے اور ہماری جانب متوجہ ہو کر فرمانے لگے "ہاں صاحب اب کہیئے کیا ارشاد ہے!" معلوم ہوا "اسیری" کے عنوان سے بانگِ درا میں جو اشعار ہیں وہ ابھی ابھی موزوں ہوئے ہیں۔

بہرکیف ان نشاط افزا صحبتوں میں اقبال کی ظرافت پرور طبیعت اپنے زور پر نظر آتی اور ان کی زبان سے ایسے ایسے لطیف فقرے چست ہوتے اور ایسی دلفریب پھبتیاں نکلتیں کہ سُننے والے پھڑک اُٹھتے۔ مگر ان کے مذاق میں واہیات باتوں اور بیہودہ گفتار کو دخل نہ ہوتا اور جب وہ ہزل کی طرف راغب ہوتے تو ان کی

مضمون آفرینی ان کے استادانہ رنگ اور قادر الکلامی کے ماتحت اس قدر دلفریب ہو جاتی۔ کہ اس میں ابتذال نام کو نظر نہ آتا۔ ان کا بلند بانگ شاعرانہ اسلوب رکیک سے رکیک لفظ میں کچھ ایسا جہانِ معنی پنہاں کر دیتا۔ کہ گوشِ سماعت پر ناگوار گذرنے کی بجائے اُلٹا اس میں دُنیا بھر کی چاشنی آجاتی اور سُننے والے اس کے لطف سے سیر نہ ہوتے۔ ایسی صحبتوں میں اقبال اپنی تمام ترسنجیدگی کے باوجود بعض اوقات عملی مذاق سے نہ چوکتے۔ بلکہ جو شخص ان کا تختہ مشق بنتا اسے خوب پریشان کرتے۔

ایک مرتبہ ہم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ گئے اجلاس کے ایام میں ایک شام ایسی بھی تھی۔ کہ ہم فارغ تھے اقبال کی طبیعت جب بیکاری سے گھبرانے لگی۔ تو وہ مجھ سے فرمانے لگے "چلو کہیں چل کے گھڑی دو گھڑی گانا ہی سُن آئیں"۔ میں پہلے تو آمادہ ہو گیا۔ مگر بعد میں کسی اچانک کام کی وجہ سے رُک گیا۔ وہ چل کھڑے ہوئے کوئی گھنٹہ بھر کے بعد جب وہ واپس لوٹے تو مسکرا رہے تھے۔ کہنے لگے "لو آج تمہیں تماشا دکھائیں"۔ میں نے استعجاب کے عالم میں دریافت کیا "آخر ہوا کیا ہے"؟ فرمانے لگے "ہونا کیا تھا بس آج ایک مولوی صاحب کو ہم نے پکڑ لیا۔ جس طوائف کے ہاں ہم گانا سُننے گئے تھے۔ وہیں کہیں اس کانفرنس کے مندوبین میں سے ایک مولوی صاحب بھی ہمارے جانے سے قبل دل بہلا رہے تھے۔ مگر آپ جب وہاں سے چمپت ہوئے تو اپنی بوکھلاہٹ کے عالم میں کانفرنس کا دعوتی رقعہ وہیں پھینک آئے تھے۔ ہم پہنچے تو طوائف نے ہم سے کہا۔ کہ جس طرح بھی ہو۔ ہم مولوی صاحب کو تلاش کر کے ان کی امانت بحفاظت ان تک پہنچا دیں۔ مگر ہم نے یہ سوچا ہے کہ یہ رقعہ نواب وقار الملک بہادر صدر ایجوکیشنل کانفرنس ہی کی معرفت کیوں نہ لوٹائیں۔ تاکہ ضابطے کی پابندی بھی ملحوظ رہے اور نواب بہادر بھی دیکھ لیں کہ دُنیا بھلی سے بھلی ہے"
اتنا کہہ کر اقبال نے کاغذ کا تختہ نکالا اور قلم پکڑ کر نواب صاحب کے نام طوائف کی طرف سے ایک مفصل خط لکھ

ڈالا۔ اس میں شام کے واقعے کی تمام تفصیل بے کم وکاست بیان کرنے کے بعد لکھا۔ کہ چونکہ بندی قبلہ مولوی صاحب کے پتے سے واقف نہیں۔ اس لئے آپ سے التماس کرتی ہے کہ ان کا کھوج نکال کر ان کے کاغذات ان تک پہنچادیں۔ اس خط کی بھنک مولوی صاحب کے کان میں بھی پڑ گئی اور وہ ہانپتے کانپتے اقبال کے پاس آئے اور لگے بے طرح منت خوشامد کرنے اور ان کی جان و مال کو دُعائیں دینے۔ مگر اقبالؔ تو گویا اسی وقت کے انتظار میں تھے۔ اب آئے ہو تو جاتے کہاں ہو کے مصداق انہوں نے حضرت کو وہ رگیدا دیا۔ کہ بس اللہ دے اور بندہ لے۔ نہ جانے آپ نے ناک سے کتنی لکیریں کھینچیں۔ تب آپکی جان چھُوٹی۔

بہرصورت اقبالؔ کی یہ ولولہ انگیز زندگی ان کی وفات سے کئی سال قبل ختم ہو چکی تھی۔ مگر آخری ایام کی افسردہ دلی کے باوجود ان کے دل سے اس پر کیف زمانہ کی یاد محو نہ ہو سکی۔ بعض اوقات مجھے سچ مچ یوں محسوس ہونے لگتا۔ گویا وہ اپنے پرستاروں کے ہر لحظہ بڑھتے ہوئے جمِ غفیر سے کچھ گھبرا سے گئے ہیں۔ جس میں دن بھر گھرے رہ کر عقیدت کے بے جان مظاہروں کے سوا انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا اور زندگی کی وہ صحیح رنگینیاں جن کی دید سے انسان میں زندہ رہنے کی اُمنگ اور عمل کی خواہش پیدا ہوتی ہے ان سے پرے ہٹتی جا رہی ہیں اس تلخ حقیقت کا اعتراف خود اقبالؔ کی طرف سے اشارۃً کئی مرتبہ ہُوا۔ ۱۹۳۵ء میں کئی مرتبہ وہ مجھے ساتھ لے کر نہر پر چلے جاتے۔ جہاں ہم لبِ جو بیٹھ کر ستمبر کی ٹھنڈی نسیم کے رُوح افزا جھونکوں میں اسی پُرانی زندگی کی یاد سے اپنے پژمردہ دلوں کو تازہ کرتے۔ گذشتہ صحبتوں کے مٹتے ہُوئے نقوش پھر واضح ہونے لگتے۔ اور ہم ان کی دلفریبیوں میں کچھ عرصہ کے لئے کھو سے جاتے۔

میں ستمبر ۱۹۳۷ء میں یُورپ کے سفر کے بعد لاہور واپس آیا۔ تو میں نے سُنا اقبال عرصہ سے صاحبِ فراش ہیں۔ اس خبر سے میرا دل بیقرار ہو گیا اور میں ان سے ملنے گیا۔ اتفاق سے وہ اکیلے تھے اس

تنہائی میں ان کے دل پر پھر وہی جوش و حرارت پیدا ہوئی اور وہ مجھ سے پوچھنے لگے "تم سال بھر کے بعد وطن واپس آئے ہو اُستاد سچ سچ کہو! اب کے جال میں کیا لگا؟" میں نے کہا "یہاں جو کچھ لگا۔ وہ آپ کے "راؤنڈ ٹیبل" والے سفر سے کم ہی ہو گا۔ ذرا اپنی مار دھاڑ کو بھی یاد فرمالیجئے"۔

اس پر اقبال ہنس پڑے۔ بولے "راؤنڈ ٹیبل" والے سفر میں رکھا ہی کیا تھا۔ رفقاء سفر منکر نکیر کی طرح ہر وقت دائیں بائیں موجود رہتے تھے"۔

میں نے انہیں گدگدانے کی نیت سے کہا "میں آیندہ سال کے اوائل میں جرمنی اور بلجیم جارہا ہوں میرا دل چاہتا ہے کہ اس مرتبہ آپ کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لے چلوں"۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کچھ افسردہ سے ہو گئے کہنے لگے" اس طویل علالت سے اگر نجات مل جاتی۔ تو شاید میں بھی کہیں جا سکتا۔ سفر کا ارادہ تو میرے دل میں بھی ہے مگر دیکھیں اس کی منظوری کب ملتی ہے" میں نے کہا "آپ کے دل میں حج کی بہت پُرانی خواہش ہے اس لئے اب کے میرے ساتھ یورپ چلئے۔ تاکہ حج کرنے سے قبل چوہوں کی تعداد پُوری نو سو ہو جائے اور گھر لوٹتے ہوئے راستے میں گناہ بخشواتے آئیں"۔

میں اُٹھ کر چلنے لگا۔ تو بولے" اب لاہور میں جم کے بیٹھنے کی کوشش بھی کرو گے یا۔ یُوں ہی جہاں نوردی میں مشغول رہو گے؟ تمہیں اس مشغلے سے فراغت ہوتی۔ تو ذرا گھڑی دو گھڑی دل بہلانے کو وہی پُرانی صورتیں اکٹھی کرتے۔ رنگِ محفل تو اس میں کیا آئے گا۔ ہاں یارانِ محفل کو پھر ایک نظر اکٹھا دیکھنے کو جی چاہتا ہے"۔

اتفاق دیکھئے کہ جنوری ۱۹۳۸ء میں پھر یورپ کی طرف روانہ ہونے سے قبل میں ڈاکٹر صاحب سے ملنے جاوید منزل گیا۔ ان پر بیماری کا اثر بہت ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی ان کے چہرے پر وہی بشاشت کھیل رہی

تھی۔ جس نے ان کی موت کے بعد بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مَیں ان کے پاس بیٹھا بیماری کی کیفیت پُوچھ رہا تھا۔ کہ میاں شاہنواز مرحوم تشریف لے آئے۔ ان کو دیکھتے ہی ڈاکٹر صاحب کہنے لگے "لو آج پھر وہی محفل قائم ہوگئی"۔ آج پھر سالہا سال کے بعد یہ موقع آیا تھا کہ ہم تینوں ایک جگہ اکٹھے ہُوئے ڈاکٹر صاحب کی طبیعت پر پھر وہی پرانا جوش وہی سابقہ ولولہ وہی گذشتہ زندہ دلی طاری ہونے لگی۔ ہمیں اس افسردہ دل کی بجُھتی۔۔۔۔ ہوئی چنگاری شعلۂ جوالہ بنتی نظر آنے لگی اور اقبال کی ظریف گفتگو ہمیں زمان و مکان کی بندشوں سے آزاد کرکے پھر اسی پرانی انجمن میں لے گئی۔ جس کے رُوحِ رواں کبھی وہ خود تھے۔ آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹنے لگے اور گذشتہ زندگی کے دلفریب واقعات سینمائی تیز رفتاری کے ساتھ یکے بعد دیگرے چلتے پھرتے دکھائی دینے لگے۔ جن کے دھندلکے میں ہمیں یوں محسوس ہونے لگا۔ گویا ہم اسی محفل میں بیٹھے ہیں۔ جس کی گرمی سے حیات جیسی مغموم اور افسردہ کرنے والی شے ایک لازوال نعمت دکھائی دیتی تھی۔ اس وقت ہم دونوں دوست ان بچوں کی طرح جو اپنی بھُولی بسری شرارتوں کو یاد کرکے لُطف لیتے ہیں اپنی بےفکری کی زندگی کے گذشتہ واقعات یاد کرنے لگے۔

یہ ہم تینوں کی آخری صحبت تھی!

مارچ میں مَیں یورپ سے واپس آیا۔ تو ڈاکٹر صاحب کی علالت آخری صورت اختیار کر چکی تھی مگر پھر بھی جس وقت مَیں ان سے ملنے گیا۔ تو ان کے بشاش چہرے پر مجھے وہ آثار نظر نہ آئے۔ جنہیں موت کا پیش خیمہ تصور کیا جاتا ہے۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ مفکرِ اسلام چند دن کا مہمان ہے۔

جس صبح اقبالؒ اپنے معبودِ حقیقی کے حضور میں پہنچے مَیں اتفاق سے لاہور میں تھا۔ رات کو مجھے دہلی جانا تھا۔ غالباً ۹ بجے کا عمل تھا۔ میں صحن میں کھڑا ضروری کاغذات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ساتھ کے کمرے

میں ریڈیو بج رہا تھا۔جس کے ارد گرد اپنے بچے شور وغل میں مصروف تھے۔ یکلخت کسی نے مجھے آواز دی۔ "غضب ہوگیا۔ ابھی ابھی ریڈیو پر اعلان ہوا ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صبح ۵ بجے انتقال فرما گئے۔"

مجھے اس خبر سے یوں دھکا سا لگا گویا کسی نے اٹھا کر پٹک دیا ہو۔ میں چُپ چاپ فرش پر بیٹھ گیا۔ میرے تمام قویٰ پر وہ ہیبتناک وحشت طاری تھی۔ جو زلزلے کے گذر جانے کے بعد عناصر کائنات میں نظر آتی ہے محسوسات کی نقشہ کشی شاید کسی مشاق ادیب کے لئے مشکل نہ ہو۔ مگر میں اس وقت اپنے خوفناک غم کے اظہار میں قاصر ہوں۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ یہ وہ غم تھا۔جس میں انسان ہائے ہائے نہیں کرتا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آتے۔ صرف اس کی نظر پتھرا جاتی ہے اور رُوح تحلیل ہونے لگتی ہے۔

میرا ارادہ تھا کہ میں اقبال کی میت کا آخری دیدار نہ کروں۔ میں نہیں چاہتا تھا ان کے موت کی افسردگی سے ہمکنار چہرے کی جھلک میرے ذہن سے زندہ دل اقبال کی بشاش صورت کے شاداب تصوّر کی متاعِ عزیز کو چھین لے۔ میں چاہتا تھا۔ کہ میرے دل کی گہرائیوں میں اقبال کے منوّر چہرے کا وہی جاندار نقشہ موجود رہے۔ جو مجھے ان کی مخصوص صحبتوں میں نظر آیا کرتا تھا۔ مگر آخر ایک اضطراری کشش نے مجھے "جاوید منزل" کی طرف کھینچا اور میں دوپہر کے وقت اپنے دوست کے حضور میں پہنچنے پر مجبور ہو ہی گیا۔

"جاوید منزل" کے اندر اور باہر آنے جانے والوں کا ایک لاتناہی ہجوم نظر آتا تھا۔ اس ہنگامے کے باوجود "جاوید منزل" پر اس بدنصیب دُلہن کی حسرتناک اُداسی ٹپک رہی تھی۔ جس کا سہاگ اس کی شادی کے اگلے ہی دن لُٹ جائے یا شاید وہ مادرِ گیتی کی بدقسمتی پہ نوحہ زن تھی۔ جس نے آج اقبال جیسا گوہر آبدار کھو کر اپنی تاریکیوں میں ہمیشہ کیلئے اضافہ کر لیا تھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا۔ کہ ان کے کمرے کی طرف بڑھوں یا یہیں سے لوٹ جاؤں۔ کہ کسی معمر شخص نے جنہیں میں اس وقت پہچان نہیں سکا۔ میرے کاندھوں پہ ہاتھ

رکھ کر کہا۔ "آپ اپنے دوست سے مل لئے ؟" بظاہر یہ الفاظ بہت سادہ تھے۔ مگر آتشِ غم میں جلتے ہوئے دل پر انہوں نے وہی کام کیا۔ جو آگ پر تیل کیا کرتا ہے اور میں اقبالؔ کے سرہانے پہنچ گیا۔ ان کے پاس شاید میں دو سیکنڈ یا اس سے بھی کم ٹھہرا۔ مگر اتنے عرصے میں میں نے دیکھ لیا کہ اقبال نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ ان کے چہرے پر اس وقت بھی ان کی فطری بشاشت کے طفیل ایک خفیف سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جس میں مجھے ان کے مخصوص خندہ استہزا کی کیفیت جھلکتی ہوئی نظر آئی۔ اس سے میری طبیعت بے اختیار بھر آئی اور دل کے بخارات پانی بن کر آنکھوں کے راستے ٹپک پڑے۔

گھر آیا تو مجھ پر ایک وحشت سوار تھی۔ گو پچھلے کئی سالوں سے میرا ان سے میل ملاپ بہت کم ہو گیا تھا اور مجھے ان کی صحبت میں بیٹھنے کے بہت کم مواقع پیش آئے تھے۔ مگر آج ان کے جانے سے مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ گویا دُنیا سونی ہو گئی ہے اور اس کی تمام رنگینیاں کرب اور مصیبت میں مبدّل ہو گئی ہیں۔ اب وہی لاہور ہے اور وہی میں ہوں۔ مگر خدا جانے ہم دونوں میں اس قدر افسردگی اور بیگانگی یکلخت کہاں سے آگئی ہے مجھے اپنے متعلق یوں محسوس ہوتا ہے۔ گویا زندگی کے تمام ولولے تمام جوش تمام حرارتیں چشم زدن میں سرد ہو گئی ہیں اب لاہور کی حیثیت اس بے جان پھول کی سی نظر آتی ہے۔ جس کی خوشگوار نکہت ہمیشہ کے لئے اُڑ گئی ہو۔

اب میں ہمیشہ سفر میں رہتا ہوں۔ مگر اس جہاں نوردی کے باوجود میرے دل سے روحانی بیتابی اور دردانگیز فراق کی کیفیت جدا نہیں ہوتی طبیعت کی بے چینی اور رُوح کی بیقراری میں فرق نہیں پڑتا اور جب چلتا چلتا تھک جاتا ہوں تو تازہ دم ہونے اور سستانے کے لئے پھر ایک مرتبہ گھر لوٹ آتا ہوں۔ مگر

گھر کے پُرسکون مناظر سے بھی میرا دل آسودہ اور رُوح مطمئن نہیں ہوتی۔ ناچار پھر رختِ سفر اُٹھاتا ہوں۔ جب سفر پہ روانہ ہونے لگتا ہوں۔ تو بچے یہ کہہ کر چمٹ جاتے ہیں کہ آپ نے تو اس مرتبہ زیادہ دیر تک ٹھہرنے کا وعدہ کیا تھا۔" مگر آہ انہیں اس بڈھے کی دلی کیفیت کا اندازہ نہیں جسے اس کے یار و دمساز، نوجوانوں کی اجنبی دُنیا میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ گئے ہوں۔

ایک فیضانی لمحے کی یاد

ڈاکٹر تاثیر۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

ایک شام کو ہم چار: تاثیر۔ چغتائی اور ان کے دو بھائی حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جاتے ہی غیر مطبوعہ اُردو کلام کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اور دلائل کی بوچھاڑ کر دی: اُردو میں آپ نے دیر سے نہیں لکھا۔ اُردو بحیثیت زبان کے مستحقِ امداد ہے۔ اُردو دان لوگ بحیثیت ہم قوم ہونیکے پیغامِ اقبال سُننے کے مستحق ہیں۔ مُسلمانانِ ہند کو اور کون اُبھاریگا؟ کارواں کے نکالنے کا آپ ہی نے مشورہ دیا تھا آپ کا غیر مطبوعہ اُردو کلام نہ ہوا تو ہماری نیازمندی لوگوں کی نظر میں مشکوک ٹھہرے گی۔ ہم کچھ نہ کچھ لیکر ٹلیں گے۔ حضرت علامہ بستر پر لیٹے ہوئے یہ سب کچھ سُن رہے تھے۔ اور مسکرا رہے تھے۔ کہنے لگے اُردو

میں شعر نازل ہی نہیں ہوتے۔ جاوید نامہ کو ابھی ابھی ختم کیا ہے اور دل و دماغ نچڑ گئے ہیں۔ اس لئے فارسی میں بھی کچھ کہنا محال ہے۔ یوں بھی فارسی کو چھوڑ کر اُردو میں کہنا سنگ مرمر کی بجائے گارے کی عمارت بنانا ہے۔ مگر تمہارے اور دیگر عزیزوں کے اصرار سے اُردو کی طرف میلان ہو رہا ہے۔ دیکھو! جو اس کی مرضی!۔ ہم نے دلائل بازی میں شکست ہوتی دیکھ کر نیاز مندی کو سہارا بنایا۔ اور "ہم اُردو غزل لے کر ٹلیں گے" کی رٹ لگانی شروع کر دی۔ علامہ" اردو غزل" سُن کر ذرا چونکے۔ کہنے لگے "یہ ایک نئی شرط لگادی" ہماری اس فقرے سے ہمت بندھی۔ سمجھے اُردو غزل نہیں تو نظم۔ یہ بھی نہیں تو غیر مطبوعہ فارسی کلام تو مل ہی جائیگا۔ اپنی اس کامیابی پر ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ کہ یکایک حضرت علامہ نے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ "تم اس وفد کے سرغنہ ہو اور شاعر ہو۔ اپنے اشعار سُناؤ۔ شاید طبیعت کو بہانہ مل جائے۔ یہ سُننا تھا کہ میری تمام شوخیوں اور مُسکراہٹوں کا خاتمہ ہو گیا۔ میں اور اپنے اشعار حضرت علامہ کو سُناؤں! مجھے کبھی اُن کے سامنے اپنے اشعار پڑھنے کی جُرأت نہ ہوئی۔ اور جب کبھی انہوں نے میری کسی مطبوعہ نظم کا ذکر کیا۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔ میری خاموشی پر حضرت علامہ پھر بولے بھئی کچھ سُناؤ گے تو شاید تمہاری قسمت کی کوئی چیز ہو جائے۔ اس پر چغتائی صاحب کارواں کے مفاد پر مجھے قربان کرتے ہوئے بول اُٹھے " وہ سمجھا تھا میں والی غزل سُنا دو"۔ باقی دو بھائی بھی ہم آہنگ ہو گئے۔ ہاں ہاں۔ سمجھا تھا میں والی غزل" علامہ اقبال مُسکرا رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور جی کڑا کر کے ایک مطلع پڑھا۔ پھر دُوسرا۔ علامہ اقبال اس کا ایک مصرع

تُم کو اپنی زندگی کا آسرا سمجھا تھا میں

دُہرانے لگے مجھے کچھ تسکین ہُوئی۔ آخری شعر پہ مجھے خود یقین تھا ؎

زلف آوارہ گریباں چاک اے مستِ شباب
تیری صورت سے تجھے دردآشنا سمجھا تھا مَیں

حضرت علامہ کو بھی پسند آیا۔ کہنے لگے زمین اچھی ہے۔ خُدا کا قافیہ کیوں چھوڑ دیا؟ اور کچھ چُپ سے ہو گئے۔ فکرِ شعر میں سر جُھکا لیا۔ ہماری اُمیدیں بلند ہو گئیں مگر مجھے ایک اور فکر لاحق ہو گیا۔ میری غزل اچھی تی۔ بہت اچھی تھی۔ لیکن اگر حضرت علامہ نے اس پر کچھ کہہ دیا۔ تو قدرِ عانیت معلوم! بے حیثیت ہو کر رہ جائیگی۔ ہاں اُردو ادب اور کارواں دولتمند ہو جائیں گے۔ مگر...... میرے دماغ میں۔ یہ کش مکش جاری تھی۔ کہ حضرت علامہ بولے اگر قافیہ بدل دیا جائے تو؟ مَیں فوراً بولا تو بہتر ہو گا۔ اور اطمینان کا سانس لیا۔ حضرت علامہ کہنے لگے۔ لو سُنو۔ تم غزل غزل پُکار رہے تھے تو غزل ہی سہی:

عرصۂ محشر میں میری خوب رُسوائی ہوئی!
داورِ محشر کو اپنا رازداں سمجھا تھا مَیں!

یہ شعر کہہ کر علامہ کچھ رُکے دو تین منٹ تک اور پھر یہ حالت تھی کہ میں نقل نہیں کر چکتا تھا کہ ایک اور شعر تیار ہوتا۔ دُوسرا شعر جاوید نامہ کی کیفیات کا حامل تھا۔

"مہر و ماہ و مشتری کو ہمعناں سمجھا تھا مَیں!"

جُوں جُوں شعر ہوتے جاتے۔ علامہ کی حالت بدلتی جاتی۔ بستر ہی میں اُٹھ کر پاؤں کے بل بیٹھ گئے آواز میں لرزش سی آگئی۔ جھُوم جھُوم کر داہنے ہاتھ کی سبابہ اُٹھا کر انشاد کرتے تھے اور اس شعر پہ ؎

تھی وُہ اِک درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا مَیں!

وُہ بھی رو رہے تھے اور ہم بھی! نہ جانے یہ غزل کتنی لمبی ہو جاتی مگر یہ فیضانی سلسلہ ایک اجنبی مُلاقاتی کی آمد سے منقطع ہو گیا۔ اور ہم اِس دراندازکو دل ہی دل میں کوستے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اِس کے بعد بہت مُلاقاتیں ہُوئیں مگر ہم نے دوبارہ اِس غزل کا ذکر تک نہ کیا اور نظرِ ثانی کے لئے بھی شعروں کی نقل نہیں دی۔ مطلع کے متعلق علاّمہ نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ یوں کر دیا جائے ؎

اپنی جولانگاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا مَیں
کِس رباطِ کہنہ کو اپنا جہاں سمجھا تھا مَیں

مگر مَیں نے تعمیلِ ارشاد نہ کرتے ہُوئے اس فیضانی لمحے کی یادگار کو جُوں کا تُوں رہنے دیا۔

اقبال کے ہاں ایک شام

ڈاکٹر سعید اللہ ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی

۱۸ر نومبر ۱۹۳۷ء کو پروفیسر عبدالواحد اور میں سر اقبال کی کوٹھی کے بائیں دروازے سے داخل ہوئے۔ علی بخش اپنے کمرے سے باہر آرہا تھا۔ اس سے علیک سلیک ہوئی۔ پوچھا کیا ہم ڈاکٹر صاحب سے مل سکتے ہیں۔ علی بخش نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کی بچی منیرہ بیمار ہے۔ ڈاکٹر آیا ہوا ہے۔ یہ کہتے ہوئے علی بخش ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں گیا اور فوراً ہی "آجاؤ جی" کی آواز آئی۔ ہم کوٹھی کے وسطی کمرے میں داخل ہوئے۔ جس کی سامنے کی دیوار پر سر اقبال کی ایک بہت بڑی تصویر آویزاں ہے۔ اس کمرے سے گذر کر بائیں ہاتھ پر جو چھوٹا کمرہ ہے۔ اس میں پہنچے۔ سر اقبال پلنگ پر لیٹے تھے۔ لحاف کو دو

دفعہ تہہ کر کے پاؤں کی طرف رکھا ہُوا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب وہی پُرانا سبز حاشیے اور بادامی رنگ کا دُھسہ لئے لیٹے تھے۔ پلنگ کے پاس میز پر کچھ کتابیں تھیں۔ اور دو تین نیچے فرش پر۔ ڈاکٹر صاحب کے پلنگ کے پاس ایک نوجوان ہندو ڈاکٹر بیٹھا تھا۔ ہم نے "السلام علیکم" کہا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب میں دائیاں ہاتھ اُٹھا کر کہا آیئے۔

میں عمومیت کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا مگر میرا اپنا تجربہ یہی ہے۔ کہ جب کبھی ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا اتفاق ہُوا۔ سلام کا جواب ہمیشہ ہاتھ اُٹھا کر دیا۔ رسمی گرمجوشی نہیں ہوتی تھی۔ اسکی جگہ خندہ پیشانی ہوتی۔ جن لوگوں کو ان سے پہلی دفعہ ملنے کا اتفاق ہوتا ان پر یہ طریق ملاقات کسی قدر گراں گزرتا۔ مگر جو ڈاکٹر صاحب کی راہ و رسم سے واقف تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ دُنیا میں شاید ہی کوئی ایسی بڑی شخصیت گزری ہو جس کا دروازہ اس طرح ہر ایک کے لئے ہر وقت کھُلا رہا ہو۔ صلائے عام تھی جس کا جی چاہتا چلا آتا۔ گھنٹوں بیٹھتا۔ باتیں کرتا۔ انہیں کبھی ناگوار نہ گزرتا۔ دو چار ملنے والے جاتے تو دو چار اور آجاتے۔ صبح سے شام تک یہ دھارا یوں ہی بہتا چلا جاتا۔ اکثر دل میں سوال پیدا ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کس وقت کھانا کھاتے ہیں۔ کب پڑھنے لکھنے کا کام کرتے ہیں! لوگ بھی ہر طرح کے ملاقات کے لئے آتے۔ ہم ملاقات کے لئے پہنچے تو دیکھا کہ کوئی حکیم صاحب تشریف فرما ہیں۔ ان سے طب سے متعلق باتیں ہو رہی ہیں۔ حکیم صاحب گئے تو اخبار نویس آگئے اور سیاسیات کی بحث شروع ہو گئی سیاسیات کی بحث چل رہی تھی کہ ایک اور بزرگ آگئے اور ڈاکٹر صاحب نے سیاسیات سے جو گریز کیا تو خوش طبعی اور لطیفہ گوئی شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب کے بعض عقیدتمند ایسے بھی تھے۔ جنہیں وہ بنایا کرتے تھے۔ دوسری دفعہ جو پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جرمن سیاح ملنے کے لئے آیا ہوا ہے۔ اور فلسفہ

خودی اور زمان و مکان پر بحث ہو رہی ہے۔ وہ صاحب اُٹھ کر گئے تو ایک پہلوان آ گئے ان سے پہلوانی کی باتیں ہوتی رہیں۔ بات کسی قسم کی ہو سر اقبالؔ کا اپنا رنگ قائم رہتا تھا۔

جو لوگ ڈاکٹر صاحب کو ان کی شاعری کے ذریعہ جانتے ہیں اُن کو اس بات کی مطلق خبر نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں مزاح اور خوش طبعی کس شدت سے تھی۔ کسی قسم کا موضوع ہو مزاح کا پہلو وہ ہمیشہ نکال لیا کرتے۔ بذلہ سنجی۔ لطیفہ گوئی اور حکایات سُنانے میں انہیں ویسا ہی کمال حاصل تھا جس طرح فلسفہ کے مسائل بیان کرنے میں جس موضوع سے بحث کرتے اُس پر گویا مُرتب اور مدوّن رسالہ پیش کر دیتے۔ اور سُننے والے کو یُوں معلوم ہوتا گویا ساری عمر صرف اسی ایک موضوع کی نذر کر دی ہے۔

لوگ مُلاقات کے لئے آتے تو سر اقبالؔ خوش ہوتے۔ مگر لوگوں کی شخصیت سے ڈاکٹر صاحب کو چنداں سروکار نہ ہوتا۔ ہر شخص ان کے لئے چند خیالات کا مجموعہ تھا۔ اس لئے ہر ایک سے اس کی بساط کے مطابق باتیں کرتے۔ اور اسی وجہ سے رسمی گرمجوشی سے نہیں ملتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو طرح طرح کے خطوط آتے۔ ہندوستان کے اور ہندوستان سے باہر کے۔ ان خطوں کا جواب وہ اپنے ہاتھ سے لکھتے۔ جو سوال کیا جاتا اس کا جواب دیتے۔ یہ کام گو بہت مشکل اور صبر آزما ہے۔ مگر یہ فرض وہ خندہ پیشانی سے انجام دیتے۔ یہ وصف سر اقبالؔ کی خصوصیات میں شامل تھا۔

گوشہ نشینی بھی ان کا ایسا وصف تھا۔ جس کی پابندی نہایت سختی سے کرتے۔ اپنے گھر سے باہر شاذ و نادر ہی نکلتے تھے۔ جسے ملنا ہوتا وہیں آ جاتا۔ چائے کی دعوت ان کے لئے نہایت تکلیف دہ ہوتی فرماتے کہ اِن پارٹیوں میں کھانے کو تو کچھ مل جاتا ہے مگر روحانی تکلیف ہوتی ہے۔

سر اقبالؔ کی "لمبی ہُوں" نہایت پُر معنی اور مخصوص چیز تھی۔ اس کا استعمال گفتگو میں اکثر ہوتا

کسی مسئلہ پر کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد خاموش ہو جاتے۔ پھر تھوڑی دیر بعد یہ "ہوں" نمودار ہوتی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ مسئلہ زیر بحث نے خیالات میں ہیجان پیدا کر دیا ہے اور مسئلہ زیر بحث کے متعلقات کی وسعتوں اور گہرائیوں میں ڈوب کر پھر سے ابھرے ہیں۔ یہ "ہوں" کی ایک صورت تھی۔ دوسری صورت یہ ہوتی۔ کہ جب کوئی شخص کوئی بات کہتا جس سے ڈاکٹر صاحب کو اتفاق نہ ہوتا۔ تو آپ خاموش رہتے۔ اور پھر کچھ وقفہ کے بعد یہ "ہوں" نمودار ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب گفتگو ہمیشہ پنجابی میں کرتے۔ اگر کوئی ایسے بزرگ تشریف لے آتے جو پنجابی سے ناواقف ہوتے۔ تو حسب ضرورت اردو۔ فارسی۔ انگریزی میں گفتگو فرماتے۔ دوران گفتگو میں جب خاموشی کا وقفہ آجاتا تو اکثر سر کے بالوں میں ہاتھ سے کنگھی کرتے اور کبھی کبھی "یا اللہ" کی ضرب لگاتے۔

یہ جملہ معترضہ کسی قدر لمبا ہو گیا۔ میں کہہ رہا تھا کہ جب ہم کمرے میں داخل ہوئے۔ تو سر اقبال پلنگ پر لیٹے تھے اور ایک نوجوان ہندو ڈاکٹر پاس بیٹھا تھا۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی بچی کو بخار اور نزلہ کی شکایت ہے۔ بچی گرم کپڑے نہیں پہنتی۔ کہتی ہے مجھے سردی نہیں لگتی۔ آخر بیمار ہو گئی۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ معمولی امراض کا علاج تو ڈاکٹر کر سکتے ہیں۔ اکثر بیماریاں اُن کے بس کا روگ نہیں۔ مثلاً تپ دق۔ ذیابطیس۔ ٹائیفائڈ۔ لاہور میں اب صرف ایک حکیم ہے۔ قرشی مگر وہ کتابیں لکھتا ہے۔ علاج معالجہ کی طرف توجہ کم کر دی ہے۔ نمونیا کا نسخہ طبیہ اور حکمی علاج کرتا ہے۔ نوجوان ڈاکٹر نے کہا نمونیا خود بخود دسویں دن غائب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب خاموش رہے۔ تھوڑی دیر

بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا "ہوں"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کل ایک حکیم میرے پاس آیا۔ شدت سے جکی تھا۔ بہت لمبی تقریر کرتا رہا۔ جب تقریر ختم کی تو میں نے پوچھا کہ آپ کے مریض بچ بھی جاتے ہیں۔ کہنے لگا۔ یہ قصّہ رہنے دیجئے۔ وقت علاج کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر خاموش رہے پھر فرمایا کسی شخص نے حکیم محمود خاں دہلوی سے کہا کہ آپ کے مریض بھی مرتے ہیں اور دوسروں کے بھی۔ پھر ان میں اور آپ میں فرق کیا ہوا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ آں قرم ساقان بے قاعدہ مے کشند و من باقاعدہ

فرمایا کہ میری والدہ کو درد گردہ اس شدت سے ہوتا تھا کہ ہمیں ان کی موت سامنے نظر آیا کرتی تھی۔ ایک دفعہ وہ درد گردہ سے بیہوش پڑی تھیں۔ رات کا وقت تھا کہ حکیم نورالدین صاحب قادیانی نے آکر ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا۔ حکیم صاحب نے جو گھر میں ہیجان دیکھا تو پوچھا کیا بات ہے ہم نے صورتِ حال بیان کی۔ حکیم صاحب نے کہا میں بھی ذرا دیکھوں۔ حکیم صاحب نے ایڑی کے قریب کسی رگ کو دبایا تو والدہ نے آنکھیں کھول دیں۔ حکیم صاحب نے کہا۔ اب رات کا وقت ہے اس وقت تو سینک کرو۔ صبح باقاعدہ علاج ہوگا۔ صبح ہوئی تو حکیم صاحب نے والدہ کیلئے چوزہ تجویز کیا۔ کہا اس کا شوربہ پیئیں اور گوشت کھائیں۔ اس علاج کا یہ اثر ہوا کہ والدہ کو پھر عمر بھر درد گردہ کی شکایت نہ ہوئی۔ والدہ عرصہ دراز تک چوزہ کھاتی رہیں۔ کھاتے کھاتے تنگ آ گئیں تو حکیم صاحب کو لکھا گیا کہ اگر مناسب ہو تو چوزے کا بدل بتادیں جواب آیا انڈہ بدل ہے۔

ایک دفعہ جب میں انارکلی میں رہتا تھا مجھے Gout کی شکایت ہوئی۔ حکیم نورالدین صاحب

لاہور آئے ہوئے تھے۔ علی بخش کو ان کے پاس بھیجا کہ میں درد کی وجہ سے چلنے سے معذور ہوں اگر آپ تشریف لے آئیں تو عنایت ہوگی۔ علی بخش کی معرفت جواب آیا کہ کھانا کھا کر مرغی کے پَر کو حلق میں ڈال کر قے کر دو۔ میں کھانا کھا چکا تھا۔ علی بخش مرغی کا پَر لایا۔ قے کر دی۔ درد جاتا رہا۔ مستقل طور پر نہیں میرے بائیں گُردے میں درد ہوا کرتا تھا۔ ڈاکٹر کے کہنے پر ایکس ریز فوٹو لیا گیا معلوم ہوا کہ گردے میں پتھری ہے۔ ڈاکٹروں نے ولایت جا کر اپریشن کروانے کی صلاح دی۔ میں جانے کو تیار ہو گیا اتنے میں مولوی میر حسن صاحب کا سیالکوٹ سے خط پہنچا۔ انہوں نے اپریشن کی مخالفت کی تھی میں نے ارادہ ترک کر دیا۔ اسی اثناء میں دہلی سے حکیم نابینا صاحب کا خط آیا کہ مجھے اخبار کے ذریعے معلوم ہُوا ہے کہ آپ پتھری کا اپریشن کروانے ولایت جا رہے ہیں۔ آپ دہلی آجائیں بغیر اپریشن کے پتھری دُور ہو جائے گی۔ میں گیا۔ چوہدری محمد حسین اور علی بخش ساتھ تھے۔ درد کم ہو چکا تھا مگر گرانی کا احساس شدت سے تھا۔ ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُنہوں نے ایک گولی دی کہ اسے ابھی کھا لیں۔ پانچ بجے سہ پہر تک گرانی جاتی رہے گی۔ چنانچہ ویسے ہی ہُوا۔ باقاعدہ علاج کے لئے دوائی دے کر رخصت کر دیا۔ لاہور آ کر دوائی شروع کی تو پیشاب کا رنگ سیاہی مائل ہونا شروع ہُوا۔ روز بروز زیادہ سیاہی مائل ہوتا گیا۔ آخر کم ہونا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ اصلی رنگ پر آ گیا۔ سال بھر دوائی کھاتا رہا۔ اس کے بعد دس سال سے درد گردہ نہیں ہُوا۔ اب چند دن ہوئے معمولی سا ہوا مگر دوسرے گردے میں۔ حکیم صاحب کو لکھا گیا۔ انہوں نے دوائی بھیج دی

کچھ دیر ڈاکٹر صاحب خاموش رہے اور اُنگلیوں سے بالوں میں کنگھی کرتے رہے۔ پھر فرمایا حیدر آباد میں ایک انگریز پروفیسر ہے جو میری بعض نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کر رہا تھا۔ اس نے

ایک دفعہ لکھا کہ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میرے جسم میں گرم ملک کے جراثیم پیدا ہو گئے اسلئے میں ملازمت چھوڑ رہا ہوں۔ میں نے اُسے لکھا کہ آپ ملازمت نہ چھوڑیں۔ گرم ملک کے جراثیم آپ کے جسم میں نہیں ہو سکتے اگر ہوں گے تو ڈاکٹر کے دماغ میں۔ باقی رہے مغربی جراثیم تو وہ میرے جسم میں ہو سکتے ہیں آپ کے جسم میں نہیں۔

فرمایا ایک دفعہ میں حکیم اجمل خان صاحب کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ رات کے دو بجے کے قریب میری ڈاڑھ میں درد ہونے لگا۔ میں نے حکیم صاحب کے ملازم کو جگایا اور اسے کہا کہ حکیم صاحب کو جگاؤ۔ اس نے کہا حکیم صاحب زنانے مکان میں سو رہے ہیں۔ یہ کام مشکل ہے۔ میں لفضد ہُوا تو وہ حکیم کو جگا کر لایا۔ میں نے حکیم صاحب سے صُورتِ حال بیان کی۔ انہوں نے ملازم سے کچھ کہا وہ تھوڑی دیر میں کوئی چیز لے آیا۔ حکیم صاحب نے کہا جس ڈاڑھ میں درد ہے اُس پر اُسے رکھ کر اُوپر کی ڈاڑھ سے دبا دیں میں نے ویسا ہی کیا۔ تھوڑی دیر میں درد جاتا رہا۔ میں نے حکیم صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا چیز تھی۔ فرمایا ہمارے بزرگوں نے نادر شاہ سے جواہرات کے تھال لیکر یہ چیز تو اسے دیدی تھی۔ جس سے اس کا درد جاتا رہا تھا۔ مگر اس کی اصلیت نہیں بتائی تھی۔ بھلا میں آپ کو کیسے بتا سکتا ہوں۔ حکیم صاحب مسکرائے۔ اور فرمایا۔ ادرک اور اس پر پِسا ہُوا نمک۔

میں نے سوال کیا کہ آپ نے "وقت" کو تلوار کہا ہے اس سے کیا مراد ہے؟

اے خوش آں وقتے کہ سیفِ روزگار

با توانا دستئ ما بود یار!

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ "وقت" تلوار اس لئے ہے کہ انسان پیدا ہوتا ہے۔ جوان ہوتا ہے

بڑھاپا آتا ہے۔ پھر موت۔ یہ وقت کی تلوار ہے۔ "وقت" ایک طرح سے رحمت بھی ہے کہ گزر جاتا ہے تکلیف آئی اور گزر گئی۔

میں نے دوسرا سوال کیا کہ حدیث ہے "دہر کو برا مت کہو دہر خدا ہے" اس کا کیا مطلب ہے پہلے تو۔ ہوں۔ ہاں۔ کرتے رہے۔ آخر کہا کہ Reality کا لازمی جزو "دہر" ہے۔ اتنا کہا اور خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا۔ پیرس میں برگساں سے جب ملاقات ہوئی تو اسے Gout کی شکایت تھی۔ پہیوں والی کرسی پہ بیٹھا تھا۔ نوکر کرسی کو چلا کر اِدھر سے اُدھر لے جاتا تھا۔ میں نے برگساں کو یہ حدیث سنائی تو کرسی سے اچھل پڑا۔ پوچھا یہ کون کہتا ہے۔ میں نے کہا ہمارا رسولؐ۔ "وقت" کو ہم Eternal مانتے ہیں مگر وہ گزر بھی رہا ہے۔ اگر ان دونوں کو ملایا جائے تو جس چیز کو ہم Now کہتے ہیں وہ Eternal now بن جاتی ہے Reality دو معنوں میں لیجا سکتی ہے ایک Extensive اور دوسرے intensive ۔ Intensive سے مراد یہ ہے کہ مثلاً ایک گیند اپنے محور کے گرد حرکت کرے اور ہر گردش میں اس کا رنگ بدل جائے۔ "وقت" کو اسی طرح تصور کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے گرد چکر کاٹ رہا ہے۔ رات اور دن کی تمیز ہم نے قائم کر رکھی ہے۔ ورنہ "وقت" تو اس تمیز سے پاک ہے۔ زرتشت تو غالباً ایک خدا کو مانتا تھا۔ مگر ایران میں یزدان اور اہرمن کی ثنویت موجود تھی۔ ایک روشنی (دن) اور دوسرا تاریکی (رات)۔ ان دونوں کا اجتماع Reality ہے۔ قرآن میں بار بار دن اور رات کا ذکر آتا ہے۔ ہندو تو "وقت" کو مایا کہتا ہے۔ بدھوں نے اس کی اصلیت کو مانا ہے اور اس کے حصے کئے ہیں وقت کا Atomic تصور بدھوں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا "وقت" کا تصور Personality کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان Truth کا متلاشی تھا۔ ایران Beauty کا اور عرب Goodness کا۔
اسلام نے تینوں کو Personality میں جمع کر دیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب پھر خاموش ہو گئے اور میں نے تصوف کی بحث چھیڑ دی۔ فرمایا تصوف ہمیشہ انحطاط کی نشانی ہوتا ہے۔ یونانی تصوف۔ ایرانی تصوف۔ ہندوستانی تصوف۔ سب انحطاطِ قومی کے نشان ہیں۔ اسلامی تصوف بھی اسی حقیقت کو عیاں کرتا ہے۔ اسلام کے اولیں دور کے صوفی زہاد تھے۔ زہد اور تقویٰ ان کا مقصد تھا۔ بعد کے تصوف میں مابعد الطبیعات اور نظریات شامل ہو گئے۔ تصوف اب محض زہد نہیں رہتا اس میں فلسفہ کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ ہمہ اوست مذہبی مسئلہ نہیں۔ یہ فلسفہ کا مسئلہ ہے۔ "وحدت اور کثرت" کی بحث سے اسلام کو کوئی سروکار نہیں۔ اسلام کی رُوح توحید ہے۔ اور اس کی ضد کثرت نہیں بلکہ شرک ہے۔ وہ فلسفہ اور وہ مذہبی تعلیم جو انسانی شخصیت کے نشو و نما کے منافی ہو بیکار چیز ہے۔ تصوف نے Scientific رُوح کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتے تعویذ تلاش کرتے ہیں۔ گوش و چشم کو بند کرنا اور صرف چشمِ باطن پر زور دینا جمود اور انحطاط ہے۔ قدرت کی تسخیر جد و جہد سے کرنے کی جگہ سہل طریقوں کی تلاش ہے۔ "شجرِ ممنوعہ" میرا خیال ہے تصوف سے مراد ہے۔ خالص اسلامی تصوف یہ ہے کہ احکامِ الٰہی انسان کی اپنی ذات کے احکام بن جائیں ؎

یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

"انا الحق" اقبال کا

پھر فرمایا۔ انا الحق کے معنے یہ نہیں کہ میں خدا ہوں۔ بلکہ اس کو یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ "انا"

ہی اصلی چیز ہے۔ بندہ اگر خدا میں گم ہو گیا۔ تو اس نے اپنی ہستی مٹا دی۔

پروفیسر عبدالواحد نے پوچھا Evolution کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ فرمایا پسندیدہ ہے مگر اسے اصلیت نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اُونٹ کی گردن اس لئے لمبی ہو گئی کہ اُسے اپنی خوراک شاخوں پر تلاش کرنی پڑی۔

تصوّف کی بحث "کرامات"۔ "دستِ غیب" اور "بخشش" کے سوال کو لے آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یہ قصے سمجھ میں تو نہیں آتے مگر اُن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے کبھی سمجھ میں آجائیں۔

دستِ غیب سے متعلق ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مولانا وحید الدین سلیم نے بارہا بیان کیا کہ جب اُن کے والد کا انتقال ہُوا۔ تو ان کے پیر حضرت غوث علی قلندر نے مولانا وحید الدین سلیم کو بلایا اور کہا کہ تمہارا باپ ہمارا دوست تھا۔ ہم تمہیں ایک وظیفہ بتا دیتے ہیں۔ جب روپے کے حصول کی اور کوئی صورت نہ ہو تو اس وظیفہ کو پڑھنا۔ پانچ روپے تمہیں مل جایا کریں گے۔ پیر صاحب سے رخصت ہو کر گھر آئے تو والدہ کو سارا قصہ سُنایا۔ اُنہوں نے کہا کہ گھر میں کچھ نہیں۔ نہ آٹا نہ دال۔ وظیفہ پڑھا گیا تکیہ کے نیچے سے پانچ روپے مل گئے۔ مولانا کا بیان ہے کہ انہوں نے اسی طرح وظیفہ پڑھ کر تعلیم حاصل کی۔ جب خود روپیہ کمانے لگے تو وظیفہ بند کر دیا۔ سر سیّد سے جب مولانا کی ملاقات ہُوئی تو مولانا نے سر سیّد سے کہا کہ آپ نیچری ہیں۔ مگر ہمارے وظیفہ کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔

کرامت کی بھی ایک مثال ڈاکٹر صاحب نے سُنائی۔ فرمایا سر سیّد احمد کی طرح ان کے باپ کے گلے میں بھی رسولی تھی۔ وہ اپنے پیر کے پاس گئے اور کہا کہ حضرت مجھے رسولی کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس کا کیا کچھ علاج کیجئے۔ پیر صاحب نے کہا۔ دیکھیں۔ سر سیّد کے والد نے سر آگے بڑھایا۔ پیر صاحب

نے ان کی ڈاڑھی کے نیچے ہاتھ پھیرا اور فرمایا بھئی ہمیں تو رسولی کہیں نظر نہیں آتی۔

بخشش کی بھی مثال سُنائی۔ فرمایا ایک سب انسپکٹر پولیس ہے وہ سانپ کے کاٹے کا دم کرتا ہے اور شفا ہو جاتی ہے کئی سو میل سے بھی دم کا اثر ہو جاتا ہے۔

خاموشی کے ذرا سے وقفہ کے بعد میں نے پوچھا "جن" کا ذکر قرآن میں آتا ہے۔ "جن" کس چیز سے عبارت ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا بعض اس کے معنے جنگلی آدمی کے بیان کرتے ہیں کیونکہ وہ چھپے ہوتے ہیں اسی مصدر سے جنت۔ جنین اور جنہ (ڈھال) نکلے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کوئی ایسی مخلوق ہو جسے ہم دیکھ نہیں سکتے۔ کئی رنگ ہیں جنہیں ہماری آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ کئی آوازیں ہیں۔ جنہیں ہمارے کان نہیں سُن سکتے۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا چند دن ہوئے میں باہر بیٹھا تھا۔ ایک فقیر ہاتھ میں ڈنڈا لئے۔ تہمد باندھے آگیا۔ میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ میری ٹانگیں دبانے لگا۔ میں مزے سے بیٹھا رہا۔ اور وہ میرے پاؤں دباتا رہا۔ آخر میں نے پوچھا۔ آپ کس طرح آئے ہیں۔ اس فقیر نے کہا میں فلاں پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اُنہوں نے مجھے کہا کہ تمہارے علاقہ کا قلندر ڈاکٹر اقبال کو مقرر کر دیا گیا ہے۔ تم ان کے پاس جاؤ۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے تو ابھی تک کوئی اطلاع اس قلندری کے بارے میں نہیں پہنچی۔ میری بات کو اس فقیر نے قلندری کے کوچہ کی کوئی رمز سمجھا۔ ٹانگیں دباتا رہا۔ اتنے میں چوہدری محمد حسین صاحب تشریف لے آئے۔ اور آتے ہی سر سکندر کے بارے میں گفتگو شروع کرنے ہی کو تھے کہ میں نے ٹوکا اور کہا چوہدری صاحب اس سکندری کو رہنے دیجئے آج یہاں قلندری کی باتیں ہو رہی ہیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: جن دنوں میں انارکلی میں رہا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جاڑے

کے موسم میں ایک فقیر نے رات کے دو بجے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ علی بخش نے دروازہ کھولا میں نے علی بخش سے پوچھا۔ کون ہے؟ اس نے کہا ایک فقیر ہے آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں بستر سے اُٹھا فقیر میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا آپ کس طرح تشریف لائے۔ کہنے لگا مجھے دُوسری جگہ جانے کا حکم ملا ہے میں جا رہا ہوں۔ اس لئے آپ سے ملنے آگیا۔ میں نے پوچھا آپ اس دُنیا کے لئے کیا کر رہے ہیں۔ کہنے لگا۔ اب امام مہدی کے ظہور کا وقت آگیا ہے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اگرچہ شدّت کی سردی تھی مگر اس فقیر نے رات کے دو بجے دہی کی لسّی پینے کی خواہش ظاہر کی۔ علی بخش گیا۔ کسی دوکاندار کو جگا کر لسّی بنوا کر لایا۔ اس فقیر نے پی اور کہا اب میں چلتا ہوں۔ میں نے کہا اس وقت تو ریل نہیں ملے گی اس نے کہا فقیر کو ریل سے کیا غرض۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: اکثر لوگ مہدی کے منتظر ہیں مگر وہ آنے میں نہیں آتا۔ ایک اور بزرگ لاہور میں ہوا کرتے تھے جب کبھی ملتے مہدی کے آنے کی تاریخ بتا جاتے۔ وہ تاریخ گزر جاتی تو ایک نئی تاریخ مقرر کر دیتے۔ اسی انتظار میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مگر مہدی کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ کچھ دن ہوئے ایک اور بزرگ تشریف لائے وہ بھی مہدی کے آنے کی خوشخبری دے گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے پہلے بھی کئی لوگ مہدی کی آمد کی خبر دے گئے ہیں۔ مگر ابھی تک وہ نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے کام مہدی کے لئے نہیں اُٹھا رکھنے چاہئیں۔

مہدی کے قصے کے بعد قدرتی طور پر مسیح کا ذکر آگیا۔ میں نے کہا احمدیوں کے بارے میں جو آپ نے رسالہ شائع کیا ہے اسمیں آپ نے لکھا ہے کہ Spengler شپینگلر نے مسلمانوں کو مجوسی اقوام میں شامل کرنے میں غلطی کی ہے Spengler نے مجوسی اقوام کی ایک خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ وہ

کسی آنے والے نبی کی منتظر رہتی ہیں۔ مسلمان کسی آنے والے نبی کے منتظر نہیں۔ میں نے کہا آپکا یہ دعوےٰ کہ مسلمان کسی آنے والے نبی کے منتظر نہیں درست نہیں کیونکہ مسلمان عام طور پر مسیح کی آمد ثانی کے منتظر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا میں اس کا قائل نہیں۔ میں نے اپنے اشعار میں اس عقیدہ کا اظہار بھی کیا ہے اسی بنا پر احمدیوں نے مسلمانوں کو میرے خلاف ابھارنے کی کوشش کی مگر وہاں کچھ اثر نہ ہوا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: میرے والد صاحب کی دکان پر ابن عربی کی فصوص الحکم باقاعدہ پڑھی جایا کرتی تھی۔ مولوی عبدالکریم صاحب قادیانی کہ ان کی آواز بلند تھی۔ یہ خدمت سرانجام دیا کرتے تھے۔ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی بھی اس صحبت میں شریک ہوا کرتے تھے۔ مجاز اور حقیقت کی داستان وہ ابن عربی سے سنتے رہے۔ یہی فلسفہ بعد میں انہوں نے حقیقی اور مجازی نبوت کی شکل میں پیش کیا۔ اس طرح گویا مرزا صاحب نے ابن عربی سے فیض حاصل کیا اور ابن عربی نے افلاطون سے۔ ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا۔ ابن عربی۔ بیدل اور ہیگل کے جال میں جو ایک دفعہ پھنس جاتا ہے۔ اس کی رہائی مشکل سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا: سیالکوٹ کا ذکر ہے میں شام کے قریب گھر سے نکلا تو دیکھا کہ ایک جگہ بہت سے احمدی جمع ہیں۔ بعض میرے واقف تھے۔ میں گیا اور ان سے دریافت کیا کہ کیا بات ہے۔ ایک صاحب نے کہا حضرت مرزا صاحب نے عبداللہ آتھم کے بارے میں جو پیش گوئی کی تھی کہ اگر وہ توبہ نہ کریگا۔ تو چار برس کے اندر مر جائیگا آج ان چار سالوں کا آخری دن ہے۔ ہم تار کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے رندانہ طریق سے کہا کہ خدا کی بات کو اس طرح نہ مان لیا کرو۔ اس کا کیا اعتبار ہے۔ انہوں نے کہا کہ خدا کی بات ہے پوری ہو کر رہے گی۔ میں نے کہا وہ پیش گوئی مشروط تھی۔ اگر عبداللہ آتھم نے چپکے سے توبہ کر لی ہو۔ تو پیش گوئی پوری نہیں ہوگی۔ اگر

ایسی صورت پیش آگئی تو پھر تم کیا کرو گے۔ وہ دن گزر گیا۔ عبداللہ آتھم نہ مرا۔ دوسرے ہی دن قادیان سے اشتہار نکلا۔ جو صورتِ حال میں نے احمدی دوست سے بیان کی تھی وہی پیش آئی۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے غیر مشروط طور پر عبداللہ آتھم کی موت کی دوبارہ پیش گوئی کی جو پوری ہوئی۔

میں نے پوچھا کیا پیش گوئیاں اور معجزات نبوت کی دلیل قرار دئے جا سکتے ہیں۔ فرمایا نہیں۔ اکثر رمل جعفر والے بھی پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ کچھ پوری ہو جاتی ہیں۔ کچھ غلط۔ یہ اتفاقی بات ہے۔ نبی کی تعلیم اور اسکی زندگی ہی نبوت کے لئے حجت ہو سکتی ہے۔

میں نے سوال کیا : میرزا محمود صاحب قادیانی سیاسیات میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ اور کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے گفت و شنید فرما رہے ہیں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔ فرمایا ہاں میں نے بھی اخباروں میں یہ خبر پڑھی ہے۔ انہوں نے کانگریس اور مسلم لیگ سے Tender مانگے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ انگریز سے کہہ رہے ہیں کہ میں تم سے خفا ہوں جلدی کرو۔ اور مجھے مناؤ۔

گفتگو کا سلسلہ یہاں تک پہنچا تھا کہ ایک بزرگ تشریف لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے نووارد سے مخاطب ہو کر کہا: کہو جی چوہدری جی آپ کے پیر صاحب کیا کہتے ہیں۔ چوہدری صاحب بولے ڈاکٹر صاحب آپ کو کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ آپ ایک دیگ پلاؤ کی پکا کر غریبوں کو کھلا دیں۔ آپ کا حلق ٹھیک ہو جائیگا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا: نہ چوہدری جی یہ بات غلط ہے۔ پہلے صحت اس کے بعد ایک کی جگہ دو دیگیں چوہدری صاحب نے کہا تو آپ کی مرضی۔ ڈاکٹر صاحب خاموش رہے۔ ذرا سے وقفہ کے بعد کہا "ہوں"۔ اور اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے سر کے بالوں میں کنگی کرنے لگے۔ پھر یکایک "یا اللہ" کی ضرب لگائی۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں نے مناسب موقع دیکھ کر پوچھا: تجزیہ نفسی Phycho-analysis

کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ فرمایا جنسی جذبات اور تحت الشعور پر علم النفس کی عمارت بنانے کے بعد فرائیڈ جنسی جذبات پر مابعد الطبیعات کی عمارت کھڑی کرنا چاہتا ہے۔ یہ ممکن نہیں۔ ذرا سے وقفہ کے بعد فرمایا۔ مجھے قبض کی شکایت تھی۔ میں نے خواب دیکھا کہ سات چور میرے مکان میں گھس آئے۔ صبح رفع حاجت کے بعد میں نے کموڈ میں نظر ڈالی تو اس میں سات سُدّے تھے۔ تجزیۂ نفسی والے اسکی کیا تشریح کریں گے۔

میں نے پوچھا غالب کی شاعری کے بارے میں آج کل یہ بحث ہو رہی ہے کہ آیا وہ قنوطی تھا یا رجائی۔ آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ فرمایا قنوطیت فلسفہ کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی اچھی چیزوں میں بھی بُرائی کا پہلو نکالا جائے۔ اس طرح کے قنوطی بُدھ مت والے ہیں یا پھر اُن کا پیرو شوپن ہاوئر Schopenhauer - اس لحاظ سے غالب قنوطی نہیں البتہ شاعر پر کبھی ایسی حالت طاری ہوتی ہے کہ وہ دُنیا سے بیزاری کی داستان بیان کرتا ہے۔ فلسفہ کی اصطلاح میں اسے قنوطیت نہیں کہتے۔ بہر حال قنوطیت سے بحث کرتے وقت اس فرق کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

اس کے بعد میں نے پوچھا تمدن Civilisatian اور تہذیب Culture آج کل اس طرح استعمال ہو رہے ہیں کہ گویا وہ ہم معنی ہے۔ آپ ان میں کس طرح امتیاز کرینگے۔ فرمایا Civilisatian کا تعلق باہر کی دُنیا سے ہے اور Culture کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ڈاکٹر صاحب بائیں ہاتھ کی اُنگلیوں سے سر کے بالوں میں کنگھی کرتے

رہے۔ پھر یکایک فرمایا: مذہب نے کچھ جانوروں کے کھانے کی اجازت دی ہے۔ اور بعض کو حرام قرار دیا ہے۔ اس مسئلہ پر طب کے نقطۂ نظر سے بحث ہو سکتی ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ اس میں جمالیات کو بھی دخل ہے اگر سب حلال اور حرام جانوروں کی دو علیحدہ فہرستیں بنائی جائیں۔ تو میرا خیال ہے حلال جانور خوبصورت نکلیں گے اور حرام بدصورت۔ اس نقطہ نگاہ سے آج تک کسی نے اس مسئلہ سے بحث نہیں کی۔

تھوڑے سے وقفہ بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا جب میں بھاٹی دروازہ میں رہا کرتا تھا ایک بزرگ مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ اس وقت میری شاعری کا آغاز تھا۔ غالباً میرے اشعار نے ملاقات کی خواہش پیدا کی ہو گی۔ میں نہانے جا رہا تھا۔ میں نے کہا آپ تشریف رکھیئے۔ میں آپ کے آنے کی اطلاع شیخ محمد اقبال کو کئے دیتا ہوں۔ نہانے کے بعد میں آیا تو ان سے کہا فرمائیے۔ میں آگیا ہوں۔ اس شخص کو نہایت مایوسی ہوئی۔ اس نے اپنے ذہن میں جو شکل میری بنا رکھی تھی غالباً میں اس معیار پر پورا نہ اترا۔ نادر خان سے جب اول مرتبہ ملاقات ہوئی۔ تو وہ کابل جاتے ہوئے لاہور میں ٹھہر گئے تھے۔ وہ میری صورت دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ کہنے لگے آپ اقبال ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا۔ کہ آپ لمبی ڈاڑھی والے بزرگ صورت ہونگے۔ میں نے کہا آپ سے زیادہ مجھے حیرانی ہے آپ تو جرنیل ہیں۔ میں سمجھتا تھا آپ دیو ہیکل ہوں گے۔ مگر آپ میں جرنیلی کی کوئی شان نہیں۔ اس قدر دُبلے پتلے۔

اس کے بعد فرمایا میں نے مومن کا دیوان نہیں پڑھا تھا۔ اب دیکھا ہے اس میں مجھے صرف ایک شعر پسند آیا ہے ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

شعر و شاعری کی بات جو شروع ہوئی تو میں نے کہا کہ آج کل ہندوستان کے قومی ترانہ کا سوال درپیش ہے۔ مسلمان بندے ماترم پر معترض ہیں۔ آپ ہندوستان کے لئے ایسا قومی ترانہ کیوں نہیں لکھتے جس میں معنوی اور صوتی لحاظ سے گرمی ہو۔ فرمایا ہندوستان میں قوم ہے کہاں جس کے لئے قومی ترانہ لکھا جائے۔

مختصر سی خاموشی کے وقفے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ میں عمر بھر کرائے کے مکانوں میں رہا ہوں۔ جاوید منزل جاوید کی ملکیت ہے۔ میں اس کو پچاس روپے ماہوار کرایہ دیتا ہوں ایک دفعہ سر ذوالفقار علی خاں مجھ سے کہنے لگے اپنا مکان کیوں نہیں بنواتے۔ میں نے کہا تم سرمایہ داروں نے چار چار پانچ پانچ مکانوں پر قبضہ جما رکھا ہے۔ ہم جیسوں کے حصے میں اپنا مکان کیسے آ سکتا ہے۔

اس کے بعد ہم نے ڈاکٹر صاحب سے اجازت مانگی۔ فرمایا جا رہے ہیں۔ اچھا۔ ہم اُٹھے اور رُخصت ہوئے۔

علّامہ اقبالؒ سے ایک مُلاقات

پروفیسر حمید احمد خاں ایم۔اے

گذشتہ ماہ رمضان کی ایک سُہانی شام کو جب ہوا کے جھونکے گلابی جاڑے کی تازگی اور کیفیت سے بس رہے تھے۔ہم علّامہ اقبال سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے۔میرے ساتھ میرے شعبۂ انگریزی کے رفیق پروفیسر عبدالواحد اور صدر شعبۂ فلسفہ ڈاکٹر سعید اللہ تھے۔خزاں کا آغاز تھا۔مگر موسم میں وہ جولانی تھی جو لاہور کا فرحت بخش آسمان بھی صرف کبھی کبھی زمین والوں کو عطا کرتا ہے۔ساڑھے چار بج چکے تھے۔سورج کے غروب ہونے میں ابھی کچھ عرصہ باقی تھا۔فضا اجلی اور نکھری ہوئی تھی۔مگر مغرب کی طرف ابر کی چند قرمزی اور نارنجی دھاریاں افق پر ایک لہریا سا بنا رہی تھیں۔ہم امپریس روڈ سے ہوتے

ہوئے اُس چھوٹی سی سڑک پر چل رہے تھے۔ جو ریلوے کے بڑے دفتر کے جنوبی رُخ کے ساتھ ساتھ جاتی ہے وہ سہ راہہ آیا جہاں یہ سڑک میورروڈ سے ملتی ہے اور ساتھ ہی ہم نے اُس مختصر سے سفید مکان پر نظر ڈالی جہاں دورِ حاضر میں حقیقت کا سب سے بڑا ترجمان اپنی خاموش مگر ہنگامہ خیز زندگی بسر کر رہا ہے۔ سڑک کے ساتھ صحن کی چھوٹی سی دیوار، اور اُس کے پیچھے یوکلپٹس کے چار پودے جو ابھی اپنے پورے قد و قامت کو نہیں پہنچے، پھر سبزے کا ایک مختصر سا تختہ جس کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے ہم مکان کی ڈیوڑھی کے پاس جاکر رُک گئے۔ اِس ڈیوڑھی کی تین محرابیں اپنے ہشت پہلو ستونوں پر سڑک سے صاف نظر آتی ہیں ڈیوڑھی کے ساتھ ہی مکان کا برآمدہ ہے۔ جس کے سفید پیل پائے طبیعت کو رعب و وقار کے بجائے حسن و لطافت کا اثر زیادہ دیتے ہیں۔ پُرانا دوست علی بخش ہمیں دیکھ کر صحن کے ایک بغلی حجرے میں سے نکلا۔ اس نے جاکر علامہ اقبال کو ہماری آمد کی اطلاع دی اور پھر فوراً واپس آکر ہمیں اندر آنے کی دعوت دی۔

برآمدے سے گذرتے ہی ہم ڈرائنگ رُوم میں داخل ہوئے۔ اِس کمرے کا سامانِ آرائش بہت سادہ اور تکلّف و تصنع سے پاک تھا۔ رواق پر شاعرِ مشرق کی ایک تصویر، دو تین فٹ اونچی، فوراً نظر کے سامنے آگئی۔ اسی کمرے سے ملحق بائیں ہاتھ کو علامہ اقبال کی خواب گاہ کی ایک کھڑکی برآمدے کی طرف کھلتی ہے۔ جس کے ساتھ ملا ہوا علامہ ممدوح کا بستر بچھا رہتا ہے۔ اب ایک عرصہ ہو گیا تھا کہ ہم جب آتے تھے۔ علامہ اقبال کو اسی بستر پر کبھی بیٹھے ہوئے مگر زیادہ تر لیٹے ہوئے پاتے تھے۔ لیکن مجھے وہ دن بھی یاد ہیں کہ میکلوڈ روڈ کے قیام کے دنوں میں حضرتِ علامہ اپنے خرمنِ فیض کے خوشہ چینوں کو کسی اور رنگ میں صلائے عام دیتے تھے۔ میں سڑک سے مڑتا تھا تو کوٹھی کے صحن میں داخل ہوتے ہی، اور بعد کے دنوں میں اُس لمبی روش پر چند ہی قدم چل کر جو مکان تک پہنچاتی تھی۔ ہمیشہ برآمدے کے ایک مخصوص گوشے

میں ڈاکٹر صاحب ایک آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے دُور سے نظر آجاتے تھے۔ برآمدے تک پہنچتے پہنچتے علی بخش پہلے سے جمی ہوئی محفل میں حسبِ ضرورت ایک یا دو کرسیوں کا اضافہ کر دیتا تھا۔

آج ڈرائینگ روم میں داخل ہوتے ہی ہم کسی قدر ٹھٹکے۔ ایک یورپین خاتون ڈاکٹر صاحب کے بستر کے برابر کرسی پر بیٹھی تھیں۔ اور ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی بچی کو گود میں لئے ہوئے تھیں۔ ہم کو دیکھتے ہی وہ اُٹھیں اور مقابل کا پردہ اُٹھا کر مکان کے اندر چلی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے تکیے کے سہارے لیٹے لیٹے ہمارے سلام کا جواب دیا۔ ہم تینوں بستر کے برابر کرسیوں پر بیٹھنے ہی کو تھے کہ ڈاکٹر صاحب ہم سے مخاطب ہوئے:۔

"کون صاحب ہیں؟"

یہ سوال سُن کر میرے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں گاہ بہ گاہ حاضر ہوتے اب سات آٹھ برس ہو گئے تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب ہمیشہ شفقت و عنایت سے پیش آتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا سوال میری سمجھ میں نہ آیا۔ اس لئے اپنے استعجاب کو چھپاتے ہوئے میں نے جواب دیا۔ "جی میں ہوں حمید احمد خاں، سعید اللہ اور عبدالواحد" اور یہ کہہ کر ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے ہم نے ڈاکٹر صاحب کے مزاج کی کیفیت پوچھی۔ اس کے بعد تھوڑی دیر تک سکوت رہا۔ جس کو ڈاکٹر صاحب نے حسبِ معمول اپنی اُس لمبی اُستادانہ "ہُوں" سے توڑا۔ جس میں بالعموم گفتگو کے لاتعداد امکانات مضمر ہوتے ہیں۔ میں نے اُس تپائی پر نظر ڈالی جو بستر کے ساتھ ہی لگی ہوئی تھی۔ پانچ سات کتابیں اس کے اوپر تھیں اور دو ایک نیچے فرش پر پڑی تھیں۔ میں نے ایک اچٹتی ہوئی نظر ان کتابوں پر ڈالی اور تھوڑے سے وقفے کے بعد پوچھا:۔

"ڈاکٹر صاحب! آج کل پڑھنے پر زیادہ توجہ ہے یا کبھی کبھی آپ کچھ لکھتے بھی ہیں"۔

"پڑھنا کیسا! کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اگر کچھ دیکھ سکوں تو پڑھوں"۔

"نظر نہیں آتا؟" ڈاکٹر صاحب کے یہ الفاظ میں نے بیحد حیرت و استعجاب کے لہجہ میں دُہرائے۔

ہاں! جب آپ لوگ میرے کمرے میں داخل ہوئے ہیں تو میں آپ کو نہیں دیکھ سکا۔ اب تھوڑی دیر گذرنے پر آپ کی صورتیں کسی قدر دھندلی نظر آرہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ Senile Cateract (موتیا بند) اُتر آیا ہے۔

سعید اللہ۔ اِن گرمی کی چھٹیوں سے پہلے آپ نے ذکر کیا تھا کہ Senile Cateract اُتر آنے کا خطرہ ہے۔ مگر یہ خیال نہیں تھا کہ اس قدر جلد اُتر آئے گا۔

ڈاکٹر صاحب:۔ جی ہاں۔ عام طور پہ لوگوں کو دیر سے اُترتا ہے۔ مجھے ذرا پہلے اُتر آیا ہے۔ میرے والد مرحوم کو جو سو سال سے کچھ زیادہ زندہ رہے۔ اسّی برس کی عمر میں اُترا تھا۔

میں۔ اس کے علاج کی کوئی صورت تو آپ کر رہے ہوں گے؟

ڈاکٹر صاحب۔ "اب اس کا اپریشن ہوگا۔ لیکن جب تک یہ پک نہ جائے اپریشن نہیں ہو سکتا۔ پکنے میں اسے پانچ مہینے لگ جائیں۔ پانچ سال لگ جائیں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ بہر حال لکھنا پڑھنا بالکل موقوف ہے۔ کیونکہ میری داہنی آنکھ تو شروع ہی سے بیکار تھی۔

"شروع ہی سے بیکار تھی؟" اب حیرت کے ساتھ اس فقرے میں ہمارا تاسّف و اضطراب بھی شامل تھا۔

"جی ہاں۔ دو سال کی عمر میں میری یہ آنکھ ضائع ہو گئی تھی مجھے اپنے ہوش میں مطلق یاد نہیں کہ

یہ آنکھ کبھی ٹھیک تھی بھی یا نہیں۔ ڈاکٹر نے خیال ظاہر کیا تھا کہ داہنی آنکھ سے خون لیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے بینائی زائل ہوگئی۔ میری والدہ کا بیان ہے کہ دو سال کی عمر میں جونکیں لگوائی گئی تھیں۔ تاہم مَیں نے اس آنکھ کی کمی کبھی محسوس نہیں کی۔ ایک آنکھ سے دن کو تارے دیکھ لیا کرتا تھا۔ (اس کے بعد ایک ایسے تبسم کے ساتھ جو گویا تاریکی کی قوتوں کے خلاف پیغمبرِ اُمید کا نعرۂ خاموش تھا) اب اگرچہ میں پڑھتا نہیں ہوں مگر پڑھنے کے بجائے سوچتا ہوں۔ جس میں وہی لُطف ہے جو پڑھنے میں (پھر ذرا سرگرمی کے ساتھ تکیے سے سر اُٹھا کر) عجیب بات یہ ہے کہ جب سے بصارت گئی ہے میرا حافظہ بہتر ہوگیا ہے۔"

اس کے بعد اِدھر اُدھر کی کچھ اور باتیں ہوئیں۔ اُس یورپین خاتون کا ذکر ہوا جو تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں ہمیں نظر آئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کے بچّوں کی گورنس ہیں اور علی گڑھ کے کسی پروفیسر کی سفارش پر ڈاکٹر صاحب نے انہیں ملازم رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "بیچاری اپنے حالات کی وجہ سے مصیبت میں تھی۔ اور ہے بڑی شریف عورت۔ بہت اچھی منتظم ہے۔ بچّوں کی تعلیم کے علاوہ اس نے گھر کا بہت سا اور کام کاج بھی سنبھال لیا ہے۔ ذرا فرصت ملتی ہے۔ تو مکان کے جھاڑنے پُونچھنے میں لگ جاتی ہے یا باورچی خانے میں جا کر ہاتھ بٹاتی ہے۔ میرا باورچی خانے کا خرچ اب ایک تہائی کم ہوگیا ہے۔ کبھی مجھے انگریزی میں خط لکھنا ہوتا ہے تو اسی کو لکھوا دیتا ہوں۔ اُردو خط جاوید لکھ دیتا ہے۔ ہاں اس سلسلہ میں ایک بڑا لطیفہ ہوا۔ میری لڑکی مُنیرہ اپنی گورنس کے ساتھ سیر کیلئے کسی طرح نہیں جانا چاہتی تھی۔ بہت دفعہ کہا مگر اُسے گورنس کے ساتھ سڑک پر نکلنا بالکل منظور نہیں تھا۔ آخر کئی دن بعد یہ راز کھُلا جب مُنیرہ نے کہا "لوگ مجھے کہیں گے میم کی بیٹی ہے"۔

انہیں باتوں میں سوا پانچ بج گئے۔ علی بخش نے آکر مہرؔ صاحب اور سالکؔ صاحب کے آنے کی اطلاع دی۔ دونوں صاحب تھوڑی دیر میں اندر داخل ہوئے۔ اور ہمارے قریب ہی دو کرسیوں پر بیٹھ گئے ان دنوں تھوڑا ہی عرصہ پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک اہم اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا۔ اور پنجاب کی یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے باہمی میثاق کے چرچے تھے۔ مدیرانِ "انقلاب" کے آتے ہی گفتگو کا رُخ سیاسیاست کی طرف پھر گیا۔

اس اثناء میں افطار کا وقت قریب آگیا۔ ڈاکٹر صاحب نے گھنٹی بجا کر اپنے ملازم رحما کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ افطار کے لئے سنگترے، کھجوریں، کچھ نمکین اور میٹھی چیزیں جو کچھ ہو سکے سب لے آئے۔

سالک صاحب۔ اُفوّہ! یہ سب کچھ منگوانے کی کیا ضرورت ہے۔ کھجوریں کافی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ (ایک ایسی شوخی سے جس میں طفلانہ معصومیت کا انداز جھلکتا تھا) سب کچھ کہہ کر ذرا رعب تو جمادیں۔ کچھ نہ کچھ تو لائے گا۔

"رحمے" نے ڈاکٹر صاحب کی ہدایات کی لفظ بہ لفظ پابندی ضروری نہ سمجھی اور قریب قریب سالکؔ صاحب کی خواہش کی پاسداری پر اکتفا کیا۔

ان سیاسی مباحث کے بعد خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اسے توڑا۔ اور کہا "ڈاکٹر صاحب گرمی کی چھٹیوں سے پہلے ہم حاضر ہوئے تھے۔ تو آپ نے غالبؔ اور بیدلؔ کے متعلق فرمایا تھا کہ آپ کی رائے میں غالبؔ نے بیدلؔ کو سمجھا ہی نہیں۔ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ بیدلؔ کا تصوف Dynamic (حرکی) ہے اور غالبؔ کا Static (سکونی)

ڈاکٹر صاحب۔ Inclined to static (مائل بہ سکوں)

میں۔ جی ہاں۔ اس سے آپ کا کیا مطلب تھا؟

ڈاکٹر صاحب۔ بیدؔل کے کلام میں خصوصیّت کے ساتھ حرکت پر زور ہے۔ یہاں تک کہ اُس کا معشوق بھی صاحبِ خرام ہے اِس کے برعکس غالب کو زیادہ تر اطمینان وسکون سے اُلفت ہے۔ بیدؔل نے ایک شعر لکھا ہے "خرام می کاشت"[1] کی ترکیب استعمال کی ہے۔ گویا سکون کو بھی بہ شکلِ حرکت دیکھا ہے۔ مثالیں اِس وقت یاد نہیں ہیں۔ لیکن اگر آپ بیدؔل کا کلام پڑھیں تو بہت سے اشعار ہاتھ آجائیں گے۔ میَں جن دنوں انار کلی میں رہتا تھا میَں نے بیدؔل کے کلام کا انتخاب کیا تھا۔ وہ اب میرے کاغذوں میں کہیں اِدھر اُدھر مل گیا ہے۔ نقشبندی سلسلے اور حضرت مجدّد الف ثانی سے بیدؔل کی عقیدت کی بنیاد بھی یہی ہے۔ نقشبندی مسلک حرکت اور رجائیت پر مبنی ہے Dynamic and Optimistic مگر چشتی مسلک میں قنوطیت اور سکون کی جھلک نظر آتی ہے Passimistic and static اسی وجہ سے چشتیہ سلسلے کا حلقۂ ارادت زیادہ تر ہندوستان تک محدود ہے۔ مگر ہندوستان سے باہر افغانستان، بخارا، ترکی وغیرہ میں نقشبندی مسلک کا زور ہے۔ دراصل زندگی کے جس جس شعبے میں تقلید کا عنصر نمایاں ہے۔ اس میں حرکت مفقود ہوتی جاتی ہے۔ تصوف تقلید پر مبنی ہے، سیاسیات، فلسفہ، شاعری یہ بھی تقلید پر مبنی ہیں۔ لیکن نقشبندی سلسلے کے شعرا مثلاً ناصر علی سرہندی کو دیکھئے۔ ناصر علی کی شاعری تقلیدی نہیں ہے۔ اسی لئے حرکت والی قوموں میں وہ زیادہ ہر دلعزیز ہے۔ ہندوستان میں ناصر علی کی کچھ زیادہ قدر نہیں ہے۔ لیکن افغانستان اور بخارا کے اطراف میں لوگ اس کی بہت زیادہ عزت کرتے ہیں۔ بیدؔل کو بھی افغانستان کے لوگ بہت مانتے ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر صاحب نے جس شعر کی طرف اشارہ کیا وہ یہ ہے سے ہر گہ دو قدم خرام می کاشت ۔ از انگشتم عصا بہ کف داشت

میں۔ اُس کے کلام کے حرکی عنصر کی وجہ سے؟

ڈاکٹر صاحب۔ (مسکراتے ہوئے) میرا خیال ہے کہ بیدل کے کلام کو سمجھنے میں انہیں مشکل پیش آتی ہے۔ اس لئے۔

سعید اللہ۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو غالب نے شروع میں بیدل کی طرح مشکل گوئی کی؟ کیا یہ صرف اس دعوے کے لئے کہ میں بھی مشکل لکھ سکتا ہوں؟

اس موقع پر قہر صاحب نے سالک صاحب کی طرف دیکھا اور دونوں صاحبوں نے باتفاق ڈاکٹر صاحب سے رخصت کی اجازت چاہی۔ چنانچہ قبل اس کے کہ ڈاکٹر صاحب سعید اللہ کے سوال کا جواب دیں کہ "ہاں جوانی میں انسان طبعاً مشکل پسند ہوتا ہے۔" دونوں حضرات ڈاکٹر صاحب کی خواب گاہ سے نکل کر ڈرائنگ روم تک جا پہنچے تھے۔ ان کی رفت و برخاست کی وجہ سے گفتگو میں قدرۃً ایک اور وقفہ آیا۔ اس کے بعد سعید اللہ نے کہا "آج کل ہندوستان کے نیشنل انیتھم کے متعلق بڑی بحث ہو رہی ہے۔ آپ کی اس مسئلے کے متعلق کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر صاحب۔ "نیشنل انیتھم" تو اُس صورت میں ہو کہ کوئی "نیشن" ہو۔ جب سرے سے "نیشن" ہی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ تو "نیشنل انیتھم" کہاں ہو سکتا ہے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ ہندوستان کو کسی "نیشنل انیتھم" کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

سعید اللہ۔ "بندے ماترم" پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ ایک تو یہ بنگالی میں ہے۔ دوسرے اس کے آہنگ میں گرمی نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب۔ (ذرا گرمی سے) آپ ہندوؤں کی شاعری میں گرمی ڈھونڈتے ہیں؟

ہندو شاعری کے تمام دفتر دیکھ ڈالیئے۔ کہیں گرمی نظر نہیں آئے گی۔ ہندو کو ہر جگہ شانتی کی تلاش ہے۔ ہندوؤں کی ادبی پیداوار میں میرے نزدیک اس کی صرف ایک استثنا ہے راماتن، اور وہ بھی بعض بعض حصّوں ہیں۔

عبدالواحد۔ مگر ہندوستان کی موسیقی تو خاصی ہیجان انگیز ہے۔ قوالی میں یہی موسیقی کافی گرمی پیدا کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب۔ مَیں اسے مصنوعی گرمی کہتا ہوں۔ جس طرح منشّیات سے کوئی شخص طبیعت میں ہیجان پیدا کرلے۔

عبدالواحد۔ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ وجد وحال کی کیفیت مصنوعی ہے؟ مثلاً ہمارے ہاں سیالکوٹ میں نوشاہیوں کا میلہ ہوتا ہے۔ وہاں قوالی سے بعض لوگ یک دم حال ہیں آجاتے ہیں۔ کیا وہ آپ کے نزدیک محض دکھاوا ہے؟

ڈاکٹر صاحب۔ ان لوگوں نے وجد وحال کو ایک (دستور) بنالیا ہے یہ کیفیت ان پر واقعی طاری ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ اپنے خوش جذبات کو اس طرح فرو کرلیتے ہیں۔ تو پھر ان میں باقی کچھ نہیں رہتا اور وہ جذبہ دوبارہ طاری نہیں ہوتا۔ دراصل مسلمان جب عرب سے نکلے اور انہیں باہر کی قوموں سے سابقہ پڑا تو صوفیہ نے ان قوموں کی طبعی نسائیت کا لحاظ کرتے ہوئے قوالی اور موسیقی کو اپنے نظام میں شامل کرلیا۔ نسائیت سے مراد فالتو جذبات ہیں۔ ایران اور ہندوستان میں فالتو جذبات کی کثرت ہے اور حال انہیں فالتو جذبات کے اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ صوفیوں کے سلسلوں میں قوالی کو جو دخل ہے وہ صرف اسی وجہ سے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی موسیقی کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ اس وقت تمام اسلامی ممالک میں اپنا اپنا مقامی فنِ موسیقی رائج ہے۔ مسلمان جہاں جہاں پہنچے وہیں کی موسیقی انہوں نے قبول کر لی۔ اور کوئی اسلامی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ فنِ تعمیر کے سوا فنونِ لطیفہ میں سے کسی میں بھی اسلامی رُوح نہیں آئی۔ اسلامی تعمیرات میں جو کیفیت نظر آتی ہے وہ مجھے اور کہیں نظر نہیں آئی۔ البتہ پچھلی مرتبہ یُورپ سے واپسی پر مصر جانے کا اتفاق پیش آیا۔ اور وہاں قدیم فرعونوں کے مقابر دیکھنے کا موقع ملا۔ ان قبروں کے ساتھ مدفون بادشاہوں کے بُت بھی تھے۔ جن میں قوت اور ہیبت کی ایک ایسی شان تھی۔ جس سے مَیں بہت متاثر ہُوا۔ قوت کا یہی احساس حضرت عمرؓ کی مسجد اور دلّی کی مسجد قوۃ الاسلام بھی پیدا کرتی ہے۔ بہت عرصہ ہُوا جب مَیں نے مسجد قوۃ الاسلام کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ مگر جو اثر میری طبیعت پر اس وقت ہُوا وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ شام کی سیاہی پھیل رہی تھی۔ اور مغرب کا وقت قریب تھا۔ میرا جی چاہا۔ کہ مسجد میں داخل ہو کر نماز ادا کروں۔ لیکن مسجد کی قوت و جلال نے مجھے اس درجہ مرعوب کر دیا۔ کہ مجھے اپنا یہ فعل ایک جسارت سے کم معلوم نہ ہوتا تھا۔ مسجد کا وقار مجھ پر اس طرح چھا گیا کہ میرے دل میں صرف یہ احساس تھا کہ میں اس مسجد میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوں۔

اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فنِ تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قوا شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قصر زہرا دیووں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ مسجد قرطبہ مہذب دیوں کا مگر الحمراء محض مہذب انسانوں کا!"

پھر ایک تبسّم کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"میں الحمراء کے ایوانوں میں جابجا گھومتا پھرا مگر جدھر نظر اٹھتی تھی دیوار پر "ھو الغالب" لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ یہاں تو ہر طرف خدا ہی خدا غالب ہے۔ کہیں انسان غالب نظر آئے تو بات بھی ہو"۔ اس کے بعد پھر تھوڑی دیر تک ہندوستان کی اسلامی عمارات کا ذکر ہوتا رہا۔ یعنی تاج محل کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

"مسجد قوۃ الاسلام کی کیفیت اس میں نظر نہیں آتی۔ بعد کی عمارتوں کی طرح اس میں بھی قوت کے عنصر کو ضعف آ گیا ہے اور در اصل یہی قوت کا عنصر ہے جو حسن کے لئے توازن قائم کرتا ہے"۔

سعید اللہ۔ "دلی کی جامع مسجد کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے"۔

ڈاکٹر صاحب۔ "وہ تو ایک بیگم ہے!"

ہم اس فقرے پہ ہنسے اور ڈاکٹر صاحب بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس منزل پہ اسلامی تعمیرات کے متعلق یہ دلکش بحث ختم ہوئی۔ اب شام کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔ اور تین گھنٹے کی اس مسلسل نشست کو طول دینا کچھ ایسا مناسب بھی نہیں تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو ان "مشورہ طلب" نگاہوں سے دیکھا جنہیں ہم نے معمولاً ڈاکٹر صاحب سے اجازت لینے کا پیش خیمہ قرار دے رکھا ہے ڈاکٹر صاحب نے حسب معمول ہم سے کہا "اچھا! چلتے ہیں آپ؟" اور اس کے بعد ہم رخصت ہوئے ۞

عُمرِ عزیز کے بہترین لمحے!

حفیظ ہوشیارپوری، ایم اے

دِل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیِ محفل کی یاد
جل گیا حاصل، مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد
(اقبالؔ)

علامہ اقبالؒ سے میری پہلی ملاقات گورنمنٹ کالج کے زمانۂ تعلیم کے دوران میں ہوئی۔ ان دنوں ہمارے کالج میں احباب کا ایک ایسا گروہ موجود تھا۔ جسے ڈاکٹر صاحب کی تعلیم اور فلسفۂ شعر سے خاص عقیدت تھی۔ ہم عموماً شام کے وقت "نیو ہوسٹل" یا "کواڈرینگل" سے "لارنس گارڈن" کی سیر کا ارادہ کر کے نکلتے

اور اکثر ایسا ہوتا کہ راستے میں ہمارا ارادہ بدل جاتا اور ہم ڈاکٹر صاحب کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر پہنچ جاتے۔ ڈاکٹر صاحب کے "جاوید منزل" میں چلے جانے کے بعد بھی ایسی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ لیکن کالج سے اس گروہ کے منتشر ہو جانے کے بعد یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

"قادیانیت" کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے پہلے اور دُوسرے بیان کی اشاعت کے درمیانی عرصے میں ہم اکثر اُن کے پاس جایا کرتے تھے اور گفتگو کا موضوع عام طور پر "قادنیت" ہوا کرتا تھا۔ ہماری تعداد پانچ چھ کے قریب ہوتی تھی۔ جس کی وجہ سے ہر ایک کو فرداً فرداً کسی خاص موضوع پر مفصّل گفتگو کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ اس لئے اُس زمانے کی کوئی خاص بات یاد نہیں، نہ اُس وقت ہمیں اُن کے "ملفوظاتِ عالیہ" کو محفوظ کرنے کا خیال تھا کیونکہ یہ معلوم نہ تھا کہ اس سرچشمۂ علم و ادب کے فیض سے ہم بہت جلد محروم ہو جائیں گے،

اس کے بعد دو تین مرتبہ پروفیسر تبسم کے ساتھ ایک دفعہ عرشی صاحب کے ساتھ اور اکثر تنہا ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ ان میں سے جو ملاقاتیں مجھے یاد ہیں اس مضمون میں اُن کا ذکر کرونگا۔

تین سال کا ذکر ہے کہ میں گورنمنٹ کالج کی "مجلسِ فلسفہ" کے لئے "بیسویں صدی میں فلسفہ اور سائنس" کے موضوع پر ایک مقالہ لکھ رہا تھا۔ چند کتابیں پڑھنے کے بعد مزید استفادہ کیلئے علامہ مرحومؒ کی خدمت میں حاضر ہُوا۔

میں نے جدید سائنس کے فلسفیانہ اور رُوحانی رجحانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا کہ اُس "روحانیت" کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے جو مغرب کے موجودہ سائنسدانوں خصوصاً سر آرتھر اڈنگٹن اور سر جیمز جینز کی تحریروں سے منسوب کی جاتی ہے اور کیا موجودہ سائنس واقعی مذہب

کی طرف آ رہی ہے؛

آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ہمیں ان حالات سے خُوش نہیں ہونا چاہیئے۔ موجودہ سائنس اُنیسویں صدی کی سائنس کے خلاف جس کی بنیاد "میکانیت" اور "مادیت" پر تھی ایک ردِ عمل ہے چونکہ مادہ کی ماہیت کے متعلق اب سائنس کا نظریہ بدل گیا ہے۔ اس لئے موجودہ انقلاب کو بعض لوگ "رُوحانیت پرستی" پر محمول کرتے ہیں، ممکن ہے مادہ کے متعلق پھر ہمارا نظریہ بدل جائے اور "رُوحانیت آمیز" خیالات کی یہ عارضی رو خس و خاشاک کی طرح بہ جائے۔ ہم زیادہ سے زیادہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ تحقیقات کے انتہائی مراحل پر سائنس کا حیرت و استعجاب سے دوچار ہو کر فلسفہ اور رُوحانیت کے دامن میں پناہ لینا اُس کے اعترافِ عجز و شکست کی دلیل ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے حقیقت کو پالیا ہے جہاں سائنس ختم ہوتی ہے وہاں سے فلسفہ شروع ہوتا ہے۔ اور حیرت و استعجاب جو سائنس کا انجام ہے فلسفہ کا آغاز ہے جو کوئی نئی بات نہیں۔ ہمیشہ سے ایسا ہوتا رہا ہے۔

اس سلسلے میں آپ نے ایک لطیفہ بھی ارشاد فرمایا۔ جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جب مَیں نے عرض کیا کہ جیمز جینز "قادرِ مطلق" کو ایک بہت بڑے ریاضی دان سے تشبیہہ دیتا ہے۔ اور اُس کے نزدیک یہ عالمِ امکان ایک ریاضی کے مسئلے کی مانند ہے جو اس کے "ذہنِ لامحدود" کی تخلیق ہے تو آپ نے ہنس کر جواب دیا کہ اس طرح آپ بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ خُدا "شاعرِ مطلق" ہے اور یہ دُنیا جو اس کی تخلیق ہے ایک ایسی نظم ہے جس کا مطلع اور مقطع ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔

کچھ عرصہ بعد اسی مجلس کے لئے مَیں ایک اور مقالہ تیار کر رہا تھا۔ جس کا موضوع یہ تھا:

"فلسفۂ جدیدہ میں قدر کا تصوّر" یعنی The conception of value in modern Philosophy

اس مقالے کے بیشتر حصے کی بنیاد میرے پہلے مقالے پر تھی، لیکن مختلف کتابوں کے مطالعہ کے بعد بھی "قدر" یعنی Value "کی ماہیت میرے لئے ایک معمہ تھی، خصوصاً یہ مسئلہ کہ "قدر" کا وجود "خارجی" ہے یا "داخلی" اس کے متعلق متضاد نظریے میری نظر سے گذرے تھے اور میں کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا۔ شکوک رفع کرنے کے لئے پھر علامہ سے رجوع کیا۔

میں نے اس مسئلے پر دو نظریے پڑھے تھے :-

(۱) "قدر" ایک خارجی حقیقت کے انکشاف کا نام ہے۔ جس کا منبع "نفسِ انسانی" کی حدود سے باہر ہے"۔

(۲) "قدر" نفسِ انسانی کی تخلیق ہے اور اس سے باہر اس کا وجود نہیں۔

پروفیسر رادھاکرشن نے جو پہلی بات کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ ان متضاد نظریوں کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا :-

(۱) "قدر" اُس حقیقت کے انکشاف کا نام ہے۔ جس کا منبع رُوحِ مطلق ہے"

(۲) "قدر" "نفسِ غیر مطلق کی استعداد کا انتہائے کمال ہے۔ میں نے علامہ مرحوم سے دریافت کیا کہ اس مسئلے پر آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

آپ نے جواب دیا کہ دونوں نظریے درست ہیں۔

میں نے کہا "وہ کس طرح"؟

آپ نے فرمایا کہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں اور تصویر ان میں سے کسی ایک کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ "قدر" کا وجود بیک وقت "خارجی" اور "داخلی" ہے۔ اور اس کو محض "خارجی" یا محض "داخلی"

تصور کرنے کی بُنیاد اُس غلطی پر ہے جس میں مغرب اور مشرق دونوں شریک ہیں۔کوئی خالص "مادی" یا کوئی خالص "رُوحانی" نقطۂ نظر "قدر" کی ماہیت کی تسلی بخش تشریح نہیں کر سکتا۔ فلسفے کی یہ روایت ہے کہ وہ عام طور پر "رُوح" اور "مادہ" دونوں میں سے ایک کو حقیقت تصور کرکے دوسرے کو "سُراب" سمجھ کر ترک کرتا رہا ہے۔حالانکہ دونوں کے امتزاج کا نام "حقیقت" ہے۔یہی روایتی غلطی مسئلہ "قدر" پر بھی اثر انداز ہوئی ہے اور اس لئے دو متضاد نظریے پیدا ہو گئے ہیں "قدر" کا سرچشمہ خارجی ہے، لیکن اس کی تخلیق میں انسانی استعداد کا بہت بڑا حصہ ہے، آپ دیکھیں گے کہ کوئی دو آرٹسٹ بعینہٖ ایک ہی چیز نہیں بنا سکتے۔دونوں کے عمل سے اپنی اپنی انفرادیت Individuauty نمایاں ہوگی۔اس کے برعکس دو سائنسدانوں کے لئے اپنے اپنے مشاہدات و تجربات سے ایک ہی "قانونِ فطرت" اخذ کرنا ممکن ہے۔

پھر جدید سائنس کی روشنی میں اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ دُنیا ایک اتفاقی ظہور ہے یا اس کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے، مجھے اس کے متعلق سر جیمز کے نظریوں میں تضاد نظر آتا تھا۔اس کا ذکر کرتے ہوتے میں نے علامہ سے کہا کہ جیمز کے نزدیک ایک طرف تو دُنیا کسی مقصد کے پیشِ نظر پیدا کی گئی ہے کیونکہ وہ "خلاق" Creator کا قائل ہے اور جہاں "خلاق" کا تصور ہوگا وہاں مقصد کا ہونا ضروری ہے، لیکن دوسری طرف وہ اس عالمِ امکاں کی ہیبت ناک وسعتوں میں انسان کو "اسٹرونومی" کی رُو سے ایک نہایت ہی غیر اہم اور بے بس چیز تصور کرتا ہے "غیر محدود قوتِ تخلیق" کا عقیدہ رکھنے کے باوجود اس کا یہ نظریہ نہایت مایوس کن ہے۔

اس تضاد کے متعلق آپ نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا کہ اس قسم کی متضاد باتیں تمام

موجودہ سائنس دانوں کے ہاں پائی جاتی ہیں، اور کہا کہ اسٹرونومی کا مطالعہ واقعی انسان کو پست ہمت کر دیتا ہے، میں ہمیشہ نوجوانوں کو اس سے منع کرتا ہوں۔

میں بعض لوگوں سے اس قسم کی باتیں سُنا کرتا تھا کہ اقبال کے فلسفے میں کوئی نئی بات نہیں۔ اُس کے تمام افکار اصل میں مغربی فلسفیوں کے افکار ہیں، ان مغربی فلسفیوں میں نیٹشے اور برگسان کا نام وہ اکثر لیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک صاحب کہا کرتے تھے کہ اقبال نے انسانیت کی تکمیل یا خودی کے مرفع کا مسئلہ نیٹشے کے نظریۂ "فوق البشر" سے لیا ہے اسی طرح "قوتِ عمل" یا "حرکت" اور مکان و زمان" کے نظریے جو اقبال کے ہاں پائے جاتے ہیں وہ "برگسان" کی کاوشِ طبع کا نتیجہ ہیں۔ ایک صاحب نے جنہوں نے "شوپنہار" کے "عزم للحیات" Will to Be کا نام سُن رکھا تھا۔ اور اس لفظ کے معانی اور شوپنہار کے مایوس کُن فلسفۂ حیات سے بے بہرہ معلوم ہوتے تھے یہاں تک کہہ دیا کہ "خودی" کی بُنیاد اسی پہ رکھی ہے۔ یہ سُن کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور میں نے اسی روز تہیہ کر لیا کہ فلسفیانہ نظموں کا ایک ایسا سلسلہ شروع کروں جس میں فلسفہ کے کسی خاص موضوع کے متعلق علامہ اقبال اور ایک مغربی فلسفی کے نظریئے مکالمے کی صورت میں پیش کیئے جائیں تا کہ اُن لوگوں پہ جنہیں مغربی فلسفیوں تک رسائی کے موقعے نہیں ملتے وہ اختلافات واضح ہو جائیں۔ جو علامہ اقبال کو فلسفۂ مغرب سے ہیں،

چنانچہ میں نے اِس سلسلے میں تین نظمیں لکھیں۔ ایک کا موضوع "خدا" تھا جسمیں "ذاتِ مطلق" کے متعلق نیٹشے اور اقبال کا مطالعہ تھا۔ باقی دو نظموں "عزم للحیات" اور "عزم للقوت" میں علی الترتیب شوپنہار و اقبال اور نیٹشے و اقبال کے مکالمے تھے۔ میں نے یہ سلسلہ جاری رکھنے کیلئے علامہ سے

اجازت طلب کی اور ایک خط کے ساتھ یہ تینوں نظمیں اُن کی خدمت میں بذریعہ ڈاک ارسال کیں۔اس خط کے جواب میں آپ کا یہ گرامی نامہ موصول ہُوا:۔

لاہور، یکم نومبر ۳۶ء

جناب حفیظ صاحب السّلام علیکم

"آپ کا خیال بہت اچّھا ہے، مگر اُردو میں خیالات کا ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کے لئے آپ کو بہت غور و فکر کرنا ہوگا۔ بحیثیتِ نظم "عزم للحیات" اوروں سے بہتر ہے۔ آپ جس وقت چاہیں تشریف لا سکتے ہیں"۔

محمد اقبال

اس کے بعد خود بھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔لیکن افسوس کہ گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے نظموں کا یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکا۔ ہم مُردہ پرستوں کی "زود پشیمانی" غور کے قابل ہے ابھی آپ کے جسدِ خاکی کو سُپردِ خاک بھی نہ کیا گیا تھا کہ بعض ایسے لوگوں نے بھی مرحُوم کی کتابیں خرید کر یا مانگ کر پڑھنی شروع کر دیں۔جو اس سے پہلے آپ کے کلام سے بالکل نا آشنا تھے یا علامہ کی شاعری کے متعلق اُن کی معلومات محض "بانگِ درا" کی چند نظموں تک محدود تھیں، اس صورتِ حالات کے پیشِ نظر جب کہ ڈاکٹر صاحب "جاوید منزل" سے "منزلِ جاوید" کو جا چکے ہیں اُن غلط فہمیوں کا دُور کرنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے جو اُن کے فلسفیانہ افکار کے متعلق پڑھے لکھے عوام میں مشہور ہیں اس لئے مَیں اس سلسلے کی طرف دوبارہ توجّہ کروں گا۔

۱۲ر فروری ۳۷ء کو "انجمنِ اُردو پنجاب" کی طرف سے "یومِ غالب" منایا گیا۔مَیں اس تقریب

یہ پیغام لینے کے لئے مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صبح کا وقت تھا۔ آپ "جاوید منزل" کے صحن کے مغربی کونے میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹانگیں چارپائی سے نیچے لٹکائی ہوئی تھیں۔ اور اُن پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن میں درد یا اسی قسم کی کوئی اور تکلیف ہے مجھے دیکھ کر فرمایا "نیازی صاحب ہیں؟" میں نے جواب دیا۔ "نہیں! میں حفیظ ہوں"۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایک دو مرتبہ پہلے بھی انہیں مجھ پر نیازی صاحب کا شبہ ہوا تھا۔ خیر میں چارپائی کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور مزاج پرسی کی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور "یوم غالب" کے لئے پیغام کی درخواست کی، اس پر آپ لیٹ گئے اور کچھ دیر خاموش رہے اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ مجھے تکلیف ہے۔ آپ جس قسم کا پیغام چاہتے ہیں خود لکھ لیں۔ میں دستخط کر دوں گا۔ چنانچہ میں نے غالب کے متعلق چند اس قسم کی سطور لکھ لیں۔ جو عام طور پر ایسی رسمی تقریبوں کے لئے لکھی جاتی ہیں۔ اس وقت یاد نہیں رہا۔ کہ میں نے کیا لکھا تھا۔ میں نے یہ پیغام انہیں پڑھ کر سنایا اور دستخط کے لئے اُن کی خدمت میں پیش کرنے ہی کو تھا کہ آپ جوش کے عالم میں فوراً اُٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے "معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے غالب کا کلام پڑھا ہی نہیں۔ آپ اُس کے فلسفہ، شعر سے بے بہرہ ہیں۔" اگر یہ الفاظ کسی اور کی زبان سے نکلتے تو شاید مجھے اپنی علمی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا احساس نہ ہوتا، لیکن مجھے معلوم تھا کہ میں کس کے سامنے ہوں اور یہ الفاظ کس کی زبان سے نکلے ہیں۔ اس لئے ندامت کے احساس سے چُپ ہو رہا۔ کوئی دو منٹ کی خاموشی کے بعد آپ نے فرمایا "لکھئے"! آپ بولتے گئے۔ اور میں لکھتا گیا۔ پھر جو کچھ لکھا تھا پڑھ کر سنایا اور آپ نے دستخط کر دیئے۔

چونکہ یہ پیغام غالب و بیدل کے فلسفۂ شعر اور اُن کے روحانی تعلق کو سمجھنے کے لئے بہت اہم ہے اور اس کا محفوظ رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ اسلئے میں اسے ذیل میں نقل کرتا ہوں:۔

اپنا پیغام تو مَیں کیا دُوں گا۔ البتہ غالبؔ کا پیغام اُن لوگوں تک پہنچا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں جو آج یومِ غالب منا رہے ہیں اُن کا پیغام یہ ہے ع

بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

مرزا آپ کو اپنے فارسی کلام کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اس دعوت کا قبول کرنا یا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔ لیکن اگر آپ اسے قبول کرنے کا فیصلہ کریں تو اُن کے فارسی کلام کی حقیقت اور اُن کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے دو باتوں کا جاننا ضروری ہے اوّل یہ کہ عالمِ شعر میں مرزا عبدالقادر بیدل اور مرزا غالب کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ دوم یہ کہ مرزا بیدل کا فلسفۂ حیات غالب کے دل و دماغ پر کہاں تک مؤثر ہُوا۔ اور مرزا غالب اس فلسفۂ حیات کو سمجھنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے۔ مجھ کو یقین ہے کہ اگر آج کل کے وہ نوجوان جو فارسی ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ کریں تو بہت فائدہ اُٹھائیں گے۔"

یہ بات موجبِ اطمینان ہے کہ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے "غالب اور بیدل" پر ایک محققانہ مقالہ لکھ کر علامہ کی زندگی ہی میں اُن کی یہ خواہش پُوری کر دی جس کا اظہار انہوں نے اپنے پیغام میں کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب سے اکثر ملاقات کرنے والوں نے جہاں مرحوم کو "رقت انگیز" کیفیت میں آنسو بہاتے دیکھا ہے وہاں آپ کے مُنہ سے علمی و ادبی لطائف کے پھُول جھڑتے بھی دیکھے ہیں۔ چنانچہ مجھے بھی

ایک دو ایسے لطیفے یاد ہیں،

ایک دفعہ عرشی صاحب اور پروفیسر تبسم صاحب کی معیت میں آپ کے پاس گیا تو اُن مضمونوں اور نظموں کا ذکر چھڑ گیا جو آج کل اُردو کے عام رسالوں میں شائع ہوتی ہیں۔ علامہ مرحوم اس بات پر اظہارِ افسوس کر رہے تھے کہ مجھے "ضربِ کلیم" کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

ہند کے شاعر و صُورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

مَیں نے یہ شعر پڑھا اور پھر مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق!" کے ان اشعار کی طرف اشارہ کیا جو آپ نے "حکمتِ فرعونی" کے عنوان کے تحت عصرِ حاضر کے متعلق لکھے ہیں ؎

دُخترانِ او بزُلفِ خودُ اسیر — شوخ چشم و خود نما و خُردہ گیر
ساختہ، پرداختہ، دل باختہ — ابرواں مثلِ دو تیغِ آختہ
ساعدِ سیمینِ شاں عیشِ نظر — سینۂ ماہی بہ موج اندر نگر!

اس کے بعد علامہ کی خدمت میں عرض کیا کہ ان فارسی اشعار میں آپ نے عورت کا ذکر جس والہانہ انداز میں کیا ہے اُس کے پیشِ نظر یہ شعر کیا آپ پر بھی صادق نہیں آتا ؎

ہند کے شاعر و صُورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ڈاکٹر صاحب نے مُسکراتے ہوئے فرمایا کہ اس شعر میں "عورت شاعر پر سوار ہے" لیکن مثنوی کے فارسی شعروں میں "شاعر عورت پر سوار ہے" اور دونوں میں فرق ظاہر ہے۔

مرحوم چونکہ خود نہایت خوش ذوق تھے اس لئے جب کسی سے کوئی لطیفہ سنتے تو بے اختیار داد دیتے۔ ایک روز میں نے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب سے پوچھا کہ آپ اقبال کے فلسفۂ شعر کی توضیح کن الفاظ میں کریں گے۔ انہوں نے جواب دیا "اقبال قرآن کا شاعر ہے اور شاعر کا قرآن ہے" اس کے بعد میں علامہ سے ملا تو خلیفہ صاحب کے اس فقرے کا ذکر کیا۔ آپ بے حد محظوظ ہوئے خلیفہ صاحب کا یہ فقرہ محض ادبی لطیفہ ہی نہیں بلکہ میں اسے علامہ کی شاعری پر مختصر مگر جامع تبصرہ سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کے پاس بعض لوگ اُن کے اشعار کے معنی پوچھنے جایا کرتے تھے۔ اگرچہ ذاتی طور پر اس سلسلے میں مجھے اُن کے پاس جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن مشہور ہے۔ کہ آپ خاموش رہا کرتے تھے، چنانچہ قبلہ تاثیر صاحب بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ علامہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے شعروں کا مطلب آپ بیان کرکے اُن کے معانی کو محدود نہیں کرنا چاہتا۔ دو ایسے حضرات کو میں بھی جانتا ہوں جو آپ کے پاس اس غرض سے گئے۔ ایک صاحب کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے میری گذارش کے جواب میں فرمایا کہ "یہ شعر میں نے آپ کے لئے نہیں لکھا"۔ دوسرے فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ارشاد کیا" میرا کام لکھنا تھا۔ میں لکھ چکا۔ سمجھنا آپ کا کام ہے"

میں اس مضمون کو ایک ایسے واقعہ کے ذکر کے بغیر ختم نہیں کر سکتا۔ جو میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب کے "روحانی تصرف" کی دلیل ہے۔

اب سے دو سال پہلے کی بات ہے کہ میں ہوشیار پور میں اپنے برادرِ اکبر شیخ عبدالرشید صاحب راحل کے پاس بیٹھا مثنوی "مسافر" کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ہم نظم کے آخری حصے پر پہنچے تو برادرِ محترم اِس مصرع پر آکر رک گئے ؎

"صدق و اخلاص و صفا باقی نماند"

اور دو تین منٹ کی خاموشی کے بعد فرمانے لگے کہ اس مصرع کے اعداد ۱۳۵۷ھ ہیں، دیکھیں دوسال کے بعد اس مصرع سے کس کی تاریخ وفات نکلتی ہے، میں یہ بات سُن کر ہنس دیا۔ اور اس مصرع کے اعداد گنے تو واقعی ۱۳۵۷ھ تھے۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ اس الہامی مصرعے کے اندر خود مصنف کی تاریخِ وفات مضمر ہے، اس واقعہ کی یاد میرے ذہن سے بالکل محو ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد جب میں نے اس مصرعے سے تاریخ نکالی تو بھائی صاحب نے اپنے خط میں یہ قصہ یاد دلایا،

اقبالؔ فی الحقیقت "صدق و اخلاص و صفا" کا مجسمہ تھا، وہ ہماری نگاہوں سے رُوپوش ہے؛ لیکن اُس کی یہ صفات ہمیشہ باقی رہیں گی۔ اقبالؔ زندۂ جاوید ہے، مرنے کے بعد اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی جھلک موت کی بظاہر کامیاب یورش پر ایک لطیف طنز تھی۔ کیونکہ ؏

چشمِ عالم سے وُہ چھپ سکتا ہے مر سکتا نہیں

یادِ ایّام

خواجہ عبدالوحید

آٹھ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو رات کے پونے نو بجے مَیں ریلوے سٹیشن پر ایک چٹھی سُپرد ڈاک کرنے کے بعد میکلوڈ روڈ کے راستہ گھر جا رہا تھا۔ جس وقت مَیں سر محمد اقبال کی کوٹھی کے سامنے سے گذر رہا تھا خیال آیا کہ علامہ محترم اس وقت اکیلے ہوں گے۔ اس لئے ملاقات کا اچھا موقع مل جائیگا۔ مَیں بالعموم ایسے ہی اوقات میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونا پسند کیا کرتا تھا۔ اس لئے کہ دوسرے لوگ بالعموم آپ کے پاس بیٹھ کر سیاسیاتِ حاضرہ پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ جو اقبال کی شخصیت کے لئے میرے نزدیک ایک کمتر موضوع تھا۔ چنانچہ موقعہ کو غنیمت جان کر میں کوٹھی کے

احاطے میں داخل ہُوا۔ حضرت علامہ برآمدے میں چارپائی پر لیٹے ہُوئے ایک چھوٹی سی کتاب دیکھ رہے تھے۔ سوائے ایک ملازم کے جو آپ کے پاؤں دبا رہا تھا۔ اور کوئی پاس نہ تھا۔

علّامہ مرحوم کے ہاں آنے جانے کی دقّت کبھی نہ ہوتی تھی۔ وہ جہاں بڑے سے بڑے آدمیوں کی کسی گرمجوشی کے ساتھ آؤ بھگت نہ کرتے تھے۔ وہاں معمولی سے معمولی حیثیت کے آدمی کے ساتھ بہت حسنِ سلوک فرماتے تھے۔ نہ کسی کے استقبال کا خاص اہتمام ہوتا تھا نہ کسی کی راہ میں رُکاوٹ پیش ہوتی۔ مَیں ہمیشہ زیادہ سے زیادہ اس بات کی ضرورت سمجھتا تھا کہ اپنے آنے کی اطلاع دیدوُں۔ اس موقع پر اس کی بھی ضرورت نہ تھی اس لئے کہ آپ نے مجھے خودُ ہی دیکھ لیا اور اپنے معتاد طریق "آیئے خواجہ صاحب!" کہہ کر مجھے قریب بُلا لیا۔ میں سلام مسنوُن کے بعد مزاج پُرسی کرکے جو بیٹھا تو نو بجے شب سے لیکر گیارہ بجے تک بڑی ہی پُرلطف صحبت رہی۔ بیشمار باتیں مختلف الانواع موضوعوں پر ہُوئیں۔ اور اس تمام عرصہ میں کوئی اور صاحب وہاں وارد نہ ہوُئے۔

جو لُطف اور خوشی مَیں نے اِن دو گھنٹوں میں حاصل کیئے وہ میری زندگی کی ایک بہت ہی غیر معمولی اور بیش بہا چیز ہے۔ مَیں شرح صدر کے ساتھ کہہ سکتا ہُوں کہ یہ دو گھنٹے میری زندگی کے بہترین اوقات میں سے تھے۔ جی چاہتا ہے کہ وہ تمام باتیں جو حضرت علّامہ نے میرے سامنے کہیں لفظ بلفظ یہاں دُہرا دوُں۔ لیکن باتوں کی کثرت ہی اس راہ میں مانع ہو رہی ہے۔

ایک بہت بڑی خوشخبری جو ڈاکٹر صاحب نے سُنائی یہ تھی کہ وہ اپنے دل میں اس بات کی زبردست خواہش رکھتے ہیں کہ قرآن حکیم کی تعلیم پر اپنے خیالات مفصل طور پر کتابی صورت میں ظاہر فرمائیں۔ وُہ فرماتے تھے: "مَیں نے اپنے خیالات کا بڑی تفصیل سے اشعار میں اظہار کر دیا ہے۔ لیکن ابھی میرے

دل میں ان سے بھی بڑی چیز ہے۔ جیسے قرآنِ حکیم کی شرح کی صورت میں ظاہر کرنے کی آرزو رکھتا ہوں"۔
لیکن وہ یہ کام اسی صورت میں یکسوئی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ کہ پانچ سال کے لئے انکو افکارِ روزگار سے کامل طور پر فرصت حاصل ہو جائے۔

افسوس کہ دُنیائے اسلام کے اس عدیم النظیر فلسفی اور کلیم کے لئے ہندوستان کی مُسلمان قوم فراغت کا سامان مہیا نہیں کر سکتی۔ مُسلمانانِ ہند کی بے سروسامانی اور بے حسی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

حضرت علامہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق فرمایا: "میرا مدت العمر کا مطالعہ اور مشاہدہ مجھے یقین دلا چکا ہے کہ یہ لوگ بالکل بیکار ہیں۔ بالخصوص ہندوستان کے تعلیمیافتہ مُسلمان"۔ ان کا خیال تھا۔ کہ اگر کبھی کام آسکتے ہیں تو غریب مزدوری پیشہ یا دُکاندار مُسلمان جن کے لئے ان کے دل میں محبت اور عزّت ہے۔ اور جن سے مل کر انہیں حقیقی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن تعلیمیافتہ مُسلمانوں کا گروہ ان کے نزدیک مستحقِ التفات نہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ قرونِ متوسطہ کے ڈکٹیٹر بن جائیں تو وہ اس گروہ کو "ہلاک" کر دیں۔

حضرت علّامہ کی غریبوں سے ہمدردی اور امیروں سے نفرت آپ کے کلام کا طغرائے امتیاز ہے۔ بالِ جبریل میں "لینن" والی نظم کے آخری اشعار کس قدر واضح ہیں۔

ے

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں سخت بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دُنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

وہ تو خدا کی زبان سے فرشتوں کے نام بھی یہ حکم سُننا چاہتے تھے کہ

اُٹھو میری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
مَیں ناخوش و بیزار ہُوں مرمر کی سِلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ایک موقعہ پر آپ نے فرمایا کہ "اسلام کا مستقبل دُنیا کے دُوسرے مُسلمانوں پر منحصر ہے نہ کہ ہندی مُسلمانوں پر"

جاپان کا ذکر آیا تو آپ نے کہا کہ جاپان میں تبدیلِ مذہب دنوں یا ہفتوں کا کام ہے نہ کہ یورپین ممالک کی طرح صدیوں کا۔ اگر اسلام کا چرچا اس ملک میں شروع ہوگیا۔ تو چند ہفتوں میں تمام جاپانی قوم مُسلمان ہو جائے گی۔ اس کی وجہ زیادہ تر سیاسی ہے۔ جاپان کے لئے مُسلمان ہو جانے میں یہ فائدہ ہو گا۔ کہ رُوس کے خلاف اُسے چین اور ترکستان میں زبردست اسلامی قوت کی امداد حاصل ہو جائیگی

۱۴ اکتوبر ۱۹۳۴ء کی شب کو مَیں سیر کرتا ہُوا پھر حضرت علامہ کے دولتکدہ پر جا نکلا۔ اسوقت آپ کے پاس قیصر صاحب۔ اُستاد عشق لہر اور ایک "حکیم صاحب" بیٹھے تھے۔ دس منٹ کے بعد وہ

لوگ اُٹھ کر چلے گئے۔ اور حضرت علامہ اور مَیں باتیں کرنے کے لئے رہ گئے۔ قریباً ایک گھنٹہ تک پُر لطف علمی گفتگو ہوا کی۔ ایک موقعہ پر گفتگو کا رُخ اس مسئلہ کی طرف پھر گیا۔ کہ اہلِ یورپ جن باتوں کا صدیوں تک تجربہ کر کے ان سے متنفر ہو چکے ہیں۔ یورپ کے ایشیائی مقلدین انہیں چیزوں کے پیچھے جا رہے ہیں مثلاً آزادئ نسواں۔ حضرت علامہ نے اس سلسلہ میں عورتوں کے متعلق بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں۔ مثلاً

I have no faith in women

یا

"عورتیں اپنے مخصوص مشاغل (مثلاً خانہ داری) میں
بھی بلند ذہنیت کا ثبوت نہیں دیتیں"

پھر حضرت علامہ نے فرمایا کہ عورت کو دماغ کمزور ملا تھا۔ اس لئے کہ Creative (تخلیقی) Function (قوت) اس کے معاملہ میں دماغ کی بجائے Womb (رحم) سے تعلق رکھتی ہے۔ مرد دماغ سے تخلیق کا کام لیتا ہے اور عورت Womb (رحم) سے۔

ماہ نومبر ۱۹۳۳ء کے آخری یکشنبہ کے روز تین چار دوستوں کے ہمراہ حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم لوگ قریباً دو گھنٹے ان کے پاس بیٹھے رہے۔ اس عرصہ میں علامہ محترم کے خیالاتِ عالیہ سے ہم لوگ بہت بڑی حد تک فیضیاب ہوئے۔ اور سب احباب کی رائے میں ہمارا وہ وقت بہت ہی بابرکت شغل میں صرف ہوا۔

حکمت و معرفت کے دریا تھے۔ جو ہمارے سامنے بہتے چلے جا رہے تھے۔ علامہ موصوف نے سیاسیات۔ اقتصادیات۔ تصوّف۔ شریعت۔ سبھی قسم کے مسائل پر رائے زنی فرمائی۔

ایک موقعہ پر آپ نے فرمایا کہ ایک قوم یا فرد کو حالات کی نامساعدت اور بخت کی نارسائی سے بھی فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ بے سروسامانی۔ اخلاص اور نفرت سے بھی انسان بیشمار فوائد حاصل کر سکتا ہے ایک مفلس آدمی جس کے پاس چھن جانے کے لئے کچھ بھی نہیں۔ یا جس کے پاس وہ مال ومتاع نہیں جس کی محبت اُسے اپنی طرف کھینچ سکے۔ وہ حق وصداقت کی حمایت میں دلیری اور جرأت دکھا سکتا ہے۔

اسی طرح ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ مَیں ملک کی سیاسیات میں فرقہ دارانہ مناقشات میں حصہ لینے کے لئے شامل نہ ہُوا تھا۔ بلکہ محض اس لئے کہ ہندوستان کے آیندہ نظامِ سیاسی میں مُسلمانوں کی حیثیت واضح کر دُوں اور یہ ظاہر کر دُوں کہ اس ملک کے سیاسی ارتقا میں حصہ لیتے ہوئے مسلمانوں کو دوسری اقوامِ ہند میں مدغم نہ ہو جانا چاہیئے۔ اُنھوں نے اس پر اصرار کیا کہ "مَیں نے اس کے سوا گول میز کانفرنس کی کسی کاروائی میں حصہ نہیں لیا"

تعلیم کا ذکر آیا تو فرمایا کہ مسلمانوں نے دنیا کو دکھانے کیلئے دنیوی تعلیم حاصل کرنی چاہی لیکن نہ تو دنیا حاصل کر سکے اور نہ دین ہی سنبھال سکے۔ یہی حال آج مُسلم خواتین کا ہے۔ جو دنیوی تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں دین بھی کھو رہی ہیں۔

۳۱ رمئی ۱۹۳۵ئہ کے روز جو ملاقات ہُوئی اس کے دوران میں مَیں نے حضرت علامہ سے "ادب لطیف" کی تعریف پوچھی۔ تو اس سلسلہ میں "ادب" اور "آرٹ" پر آپ نے بہت سی پُراز معلومات اور دلچسپ باتیں ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگرچہ آرٹ کے متعلق دو نظریئے موجود ہیں اول یہ کہ آرٹ کی غرض محض حُسن کا احساس پیدا کرنا ہے۔ اور دوم یہ کہ آرٹ سے انسانی زندگی کو فائدہ

پہنچنا چاہیئے۔ ان کا ذاتی خیال یہ ہے کہ آرٹ زندگی کے ماتحت ہے۔ ہر چیز کو انسان کی زندگی کیلئے وقف ہونا چاہیئے۔ اور اس لئے ہر وہ آرٹ جو زندگی کے لئے مفید ہو اچھا اور جائز ہے اور جو زندگی کے خلاف ہو جو انسانوں کی ہمتوں کو پست اور ان کے جذبات عالیہ کو مردہ کرنے والا ہو قابلِ نفرت و پرہیز ہے اور اسکی ترویج حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دی جانی چاہیئے۔

اس پر حکومت کے فرائض پر اظہارِ خیالات ہونے لگا۔ اور آپ نے فرمایا کہ حکومت کا سب سے بڑا فرض افراد کے اخلاق کی حفاظت ہے لیکن اس اہم ترین فرض کو دُنیائے جدید تسلیم ہی نہیں کرتی حکومتیں محض لوگوں کے سیاسی خیالات و رجحانات سے تعلق رکھتی ہیں۔ افراد کے اخلاق کو درست کرنا اپنے فرائض میں داخل ہی نہیں سمجھتیں۔

پھر اسلام اور تہذیبِ حاضرہ کا ذکر ہوا۔ فرمانے لگے کہ اسلام تہذیبِ حاضرہ کی تمام ضروری اور اصولی چیزوں کا دشمن ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اُسے تباہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ نہ یہ کہ ان چیزوں کو جزوِ اسلام بنا لیا جائے۔

آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اب دُنیا اسلام کی طرف آ رہی ہے۔ اس لئے اگر آج تہذیبِ مغربی تباہ ہو جائے تو اسلام کا بول بالا ہو جائے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کو اُس آنے والے دَور کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ جس وقت تہذیبِ جدیدہ کا خاتمہ ہو مسلمانوں کو اسلام کا علم بلند کر دینا چاہیئے۔

آرٹ کے مضر اثرات کے متعلق آپ نے فرمایا کہ بعض قسم کا آرٹ قوموں کو ہمیشہ کے لئے مردہ بنا دیتا ہے۔ چنانچہ ہندو قوم کی تباہی میں اس کے فنِ موسیقی کا بہت حصہ رہا ہے۔

میں جب کبھی حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تو ایسے وقت کی تلاش میں رہتا جبکہ

طویل فراغت حاصل ہوتا کہ اطمینان کے ساتھ ان کی صحبتِ بابرکات سے فیضیابی ہو سکے۔ اس لئے کہ جہاں ان تک رسائی آسان ہوتی وہاں رخصت حاصل کرنا محال ہوتا۔ اس لئے کہ ان کے ارشادات عالیہ کا سلسلہ بہتے ہوئے دریا کی روانی کے مثل تھا۔ نہ وہ رُکتا اور نہ آدمی رخصت لے سکتا۔ چنانچہ ۱۵ر جون ۱۹۳۵ء کو مجھے ایک قادیانی احمدی نے رسالہ دیا جو دراصل مرزا البشیر الدین محمود کا وہ خطبہ جمعہ تھا جو انہوں نے سر محمد اقبال کے بیانات کے خلاف انہی دنوں دیا تھا۔ ۱۶ر جون کی صبح کو دفتر جاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ حضرت علامہ کو وہ رسالہ دکھاتا جاؤں۔ وہاں جو ٹھہرا تو ساڑھے بارہ بج گئے ڈاکٹر صاحب نے دریافت فرمایا کہ انجمن خدام الدین کا انگریزی اخبار "اسلام" کا آیندہ پرچہ کب چھپے گا۔ میں نے عرض کیا کہ پرچہ پریس میں جا رہا ہے۔ اس پر آپ نے اسی پرچہ کے لئے بیان لکھوایا۔ پھر اس کی کانٹ چھانٹ میں بہت وقت صرف ہوا۔ اس بیان کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اسی چٹھی کی نقل بھی دی جو انہی دنوں اسٹیٹسمین میں شائع ہوئی تھی۔ تاکہ اُسے بطور مضمون "اسلام" میں شائع کر دیا جائے۔

۱۹ر دسمبر ۱۹۳۵ء کے روز حضرت اُستاذی المحترم مولانا احمد علی صاحب کے فرزندِ اکبر حافظ حبیب اللہ صاحب کی معیت میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حافظ صاحب کو بہت مُدت سے ملاقات کا شوق تھا۔ باتوں باتوں میں جہاد پر گفتگو شروع ہو گئی۔ میں نے پوچھا کہ جہاد جارحانہ ہونا چاہئیے یا دفاعی۔ فرمانے لگے کہ عام طور پر تو دفاعی ہے۔ لیکن بوقت ضرورت جارحانہ بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کسی قوم کی بداخلاقی اسقدر بڑھ جائے کہ اس سے ہمسایہ قوموں کے اخلاق تباہ ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔ تو ہمسایہ مسلمان حکومت کا فرض ہے کہ وہ بزورِ شمشیر اس قوم میں سے خرابی کو مٹانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ سُلطان شہید ٹیپو نے مالابار کے غیر مسلم وحشی باشندوں سے کہا تھا کہ

تم لوگ بجائے برہنہ پھرنے کے کپڑے پہننا شروع کردو۔ ورنہ میں بزورِ شمشیر تمہیں کپڑے پہننے پر مجبور کردوں گا۔

نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ قرآن میں مسلمانوں کو جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اشاعت حق کے پیچھے شمشیر کی حمایت ہونی چاہیئے۔ اس لئے کہ بغیر طاقت کے امر و نہی کیسے ممکن ہوسکتی ہے۔ اگر امر و نہی کے فرائض مسلمان ادا کرنا چاہتے ہیں تو ان کے ہاتھوں میں تلوار کا ہونا ضروری ہے۔

میری آخری ملاقات حضرت علامہ سے ان کی وفات سے قریباً ایک ہفتہ پہلے ہوئی۔ آپکے مرض الموت میں میں قریباً ہر روز "جاوید منزل" جاتا۔ لیکن اس خیال سے باہر سے ہی مزاج پُرسی کر لیتا کہ اگر حاضرِ خدمت ہُوا تو آپ باتیں کریں گے اور اس سے آپ کو تکلیف ہوگی۔ ایک روز دوپہر کے وقت میں کوٹھی کے احاطہ میں علی بخش کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ حضرت علامہ نے اندر سے دیکھا اور یہ معلوم ہونے پر کہ میں آپ کی مزاج پُرسی کر رہا ہوں مجھے اندر بُلا بھیجا۔ میں حاضر ہُوا۔ مزاج پُرسی کے بعد میں نے پُوچھا کہ آج کل علاج انگریزی ہے یا یُونانی۔ فرمانے لگے۔

I have lost all faith in allopothy

اس کے بعد ارشاد ہُوا۔

There can be no sciencc of medicine, for there is no science of life

پھر فرمایا۔

How can you have a science of something the reality of which you can not know

اس کے بعد تمدنِ اسلام اور دوسرے موضوعوں پر گفتگو ہوئی۔ آپ بڑے جوش سے باتیں کرتے رہے۔ اس وقت آپ کو شدید درد تھا۔ درد کی شدت سے مجبور ہو کر آپ بستر پہ اُلٹے لیٹ لیٹ جاتے۔ لیکن پھر فرطِ جوش سے سیدھے بیٹھ جاتے اور گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیتے۔ میں دل ہی دل میں افسوس کر رہا تھا کہ کیوں اندر آیا۔ نہ میں حاضرِ خدمت ہوتا نہ آپ کو زحمتِ گفتگو ہوتی

وفات سے پہلے روز صبح کو میں جاوید منزل گیا۔ حضرت علامہ چائے نوش فرما رہے تھے۔ میں سامنے ہو کر زحمتِ گفتگو بھی نہ دینا چاہتا تھا۔ اور بغیر دیکھے بھی نہ رہنا چاہتا تھا۔ شاید فطرت اندر ہی اندر یہ احساس دلا رہی تھی کہ آج اس یگانۂ دہر کی مادی زندگی کا آخری روز ہے۔ اس کے بعد وہ صورت دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔ میں درمیانی کمرے میں جہاں آپ کا بڑا فوٹو آویزاں ہے بیٹھ گیا۔ آپ چائے پی رہے تھے اور میں اپنی جگہ سے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن آنکھیں نہ ملاتا تھا۔ مبادا دیکھ پہچان کر اپنے پاس بلالیں۔ اسی عالم میں بصد حسرت باس ہی کچھ دیر کے بعد رخصت ہوا۔ اُس روز میں نے حضرت علامہ کی صورت کی آخری جھلک پائی۔ دوسرے روز علی الصبح ایک دوست یہ روح فرسا خبر لائے کہ علامہ محترم نے اس دُنیائے آب و گل سے عالمِ جاوید کا سفر اختیار فرمالیا۔

اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون

حضرت علّامہ

عبد الواحد ایم اے

میں ۱۹۱۷ء میں مرے کالج سیالکوٹ کی انٹرمیڈیٹ جماعت کے سالِ اوّل میں داخل ہُوا ان دنوں وہاں عربی کے پروفیسر مولوی میر حسن مرحوم تھے۔ مولوی صاحب کو سیالکوٹ میں ہر چھوٹا بڑا جانتا تھا۔ ان کی خودداری اور وضعداری ضرب المثل تھیں۔ اُن کی شخصیت اسقدر پُروقار اور بارعب تھی اور وہ اسقدر معاملہ فہم اور نکتہ شناس تھے کہ گو وہ انگریزی بالکل نہ جانتے تھے پرنسپل صاحب کالج کے تمام انتظامی معاملات میں سب سے پہلے ان سے استصوابِ رائے کرتے۔ مولوی صاحب بہت ضعیف تھے۔ ایک لمبا سا عصا ہاتھ میں رکھتے اور اس کے سہارے نہایت آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدم لیکر

چلتے۔ لیکن پابندیٔ اوقات کا یہ عالم تھا کہ کالج میں وقت مقررہ سے نہ کبھی ایک سیکنڈ پہلے پہنچتے نہ بعد۔ وہ اپنے مکان سے کالج تک جو کم و بیش دو میل کا فاصلہ تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچتے۔ لیکن جاتے ہمیشہ پیدل۔ ایک دن پرنسپل صاحب نے ان سے کہا کہ مولوی صاحب آپ تانگے پر آیا کیجئے الاؤنس آپ کو کالج دیدیگا۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ٹانگوں میں جو رہی سہی سکت ہے وہ بھی کھو دوں۔ اسی طرح چشمہ لگانے کے سخت مخالف تھے۔ گو بینائی اسقدر کمزور تھی کہ پڑھتے وقت کتاب بلا مبالغہ ناک سے چھو جاتی۔ اُن کا لباس تمام تر سفید ہوتا تھا۔ شاید سفید داڑھی کی مناسبت سے۔ گرمیوں میں لٹھے کا پاجامہ اور ململ کا لمبا کرتہ اور پگڑی۔ جاڑوں میں پاجامہ اور کرتہ رُوئی دار۔ کالج میں لڑکے اور پروفیسر سب ان سے اسقدر مرعوب تھے کہ ان کو دُور سے آتے دیکھ کر یا تو راستے سے ہٹ جاتے یا جلدی سے سلام کر کے ایک طرف کو ہو جاتے۔ اُن کے طالب علم جو اُن سے عربی پڑھتے تھے کچھ سہمے سے رہتے تھے۔ ہم نے سُن رکھا تھا کہ وہ علم کا سمندر ہیں۔ لیکن اُن سے کچھ حاصل کرنا بڑے دل گُردے کا کام ہے کیونکہ وہ شروع شروع میں بہت سختی کرتے ہیں اور بات بات پر ڈانٹ دیتے ہیں۔ جو شخص یہ پہلا مرحلہ کامیابی سے طے کر لے پھر اس پر اپنا فیض عام کر دیتے ہیں۔

مَیں نے عربی نہیں لے رکھی تھی۔ لیکن چونکہ پڑھنے پڑھانے کا شوق تھا۔ اس لئے مولوی صاحب کی قابلیت سے حتی المقدور استفادہ کرنے کی خواہش ہمیشہ سے دل میں موجزن تھی۔ میرے لئے ان میں جو جاذبیت تھی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اقبالؔ کے اُستاد تھے۔ کالج میں داخل ہوتے ہی مَیں نے فیصلہ کیا کہ مولوی صاحب کی خدمت میں بحیثیت شاگرد حاضر ہونے کا یہ سب سے اچھا موقعہ ہے۔ اب مَیں بہانہ ڈھونڈنے لگا۔ کہ کس ترکیب سے اُن کے پاس جاؤں۔ ان دنوں میں مولوی محمد علی صاحب

کا قرآن شریف کا ترجمہ پڑھا کرتا تھا۔ مَیں نے سوچا کہ مولوی صاحب سے یہی کیوں نہ پوچھ لیا جائے۔ کہ آپ معجزات کی استدلالی تاویل کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ چنانچہ ایک دن جب وہ فارغ بیٹھے تھے، مَیں لرزتا کانپتا ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ اور سلام عرض کیا۔ ادھر سے کچھ جواب نہ ملا۔ مَیں خاموش بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمانے لگے۔ "کہو بھئی کیا کہتے ہو۔ مَیں نے عرض کیا۔ کہ آج کل مَیں مولوی محمد علی صاحب کا ترجمہ پڑھ رہا ہوں۔ اس کے پڑھنے سے میرے ذہن میں ہیجان سا پیدا ہو گیا ہے آپ سے درخواست کرنے آیا ہوں کہ آپ معجزات کی حقیقت پر کچھ روشنی ڈالیں۔ "تو یعنی تم نیچری ہو گئے ہو۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ تمہارا کیا کام ہے یہاں۔ جاؤ محمد علی کے پاس۔ نکل جاؤ"۔ مَیں گھبرایا تو بہت۔ لیکن دل کڑا کر کے خاموش بیٹھا رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ پسیجے۔ اور کہنے لگے کہ آج فرصت نہیں۔ کل آنا۔

اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ مولوی صاحب محض خشک عالم تھے۔ ان کی طبیعت کا ایک لطیف پہلو بھی تھا۔ لیکن ان کی ظرافت اور شگفتہ مزاجی خاص خاص موقعوں پر ظاہر ہوتی تھی۔ ان کی گلی کے سامنے بازار میں کنجڑوں اور کنجڑیوں کی گویا مارکیٹ لگا کرتی تھی۔ آپ خود سبزی خریدا کرتے تھے ان خرید و فروخت کے وقت کنجڑوں اور خاص کنجڑیوں سے جو مزے کی باتیں ہوتیں اور جو قہقہوں کی آوازیں بلند ہوتیں وہ اس بازار میں رہنے والے لوگ کبھی نہیں بھول سکتے۔ ان دنوں کالج کے نزدیک ایک میدان میں جلاہیاں تانا تنا کرتی تھیں۔ جب وہ مولوی صاحب کو دُور سے آتا دیکھتیں تو مارے خوشی کے اُچھل پڑتیں اور کہتیں "وہ بابا آیا"۔ مولوی صاحب ٹھہرتے نہیں تھے۔ لیکن اُن کو وہاں سے گزرتے گزرتے کوئی پندرہ منٹ ضرور لگ جاتے۔ اور اس دوران میں ہر ایک جلاہی سے کوئی نہ

کوئی ہنسی ٹھٹھے کی بات ضرور ہو جاتی۔ ایک دفعہ مولوی صاحب سٹاف میٹنگ میں دو منٹ دیر سے پہنچے یہ واقعہ اسقدر خلافِ معمول یا یُوں کہیئے کہ خلافِ عادت تھا کہ کالج میں چرچا ہو گیا۔ ہر ایک یہ کہتا پھرتا تھا کہ مولوی صاحب کل دو منٹ دیر سے آئے۔ مَیں نے اتفاقاً پرنسپل صاحب سے پُوچھا "سُنا ہے کہ مولوی صاحب کل وقت پر نہ پہنچ سکے۔ کیا یہ دُرست ہے"۔ پرنسپل صاحب نے کہا "ہاں درست ہے۔ اور میں تمہیں مولوی صاحب کا ایک لطیفہ سُناتا ہُوں۔ کل جب وہ سٹاف رُوم میں داخل ہُوئے تو میں نے ازراہِ تمسخر گھڑی دکھاتے ہُوئے مولوی صاحب سے کہا کہ دیکھئے مولانا آپ نے ہمیں پورے دو منٹ تک انتظار کرایا۔ مولوی صاحب نے فوراً کہا "بھئی ایسی بھی کیا بات ہے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے اس دُنیا میں تمہارا کتنے برس انتظار کیا" (پرنسپل صاحب کی عُمر اس وقت کوئی بیئتالیس سال تھی)

مَیں سمجھتا ہُوں کہ اقبال کی خودداری وضعداری اور شگفتہ مزاجی کو ان کے اُستاد کی طبیعت کی بھی خصوصیات سے ایک گہری مناسبت ہے۔

مجھے اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف سب سے پہلے ان دنوں حاصل ہُوا۔ جب وہ میکلوڈ روڈ والے مکان میں رہتے تھے۔ مَیں کئی دفعہ اس سڑک پر سے گزرا کرتا تھا۔ اور ہر دفعہ نگاہ خود بخود ان کے مکان کے دروازے کی طرف جاتی۔ جس میں سے کچھ فاصلے پر برآمدے کے دو ستون دکھائی دیتے تھے اور بس۔ گو اقبال کو دیکھنے کی خواہش مدت سے تھی لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بغیر تقریب کے کسی طرح چلا جاؤں۔ اور اقبال کا میری طبیعت پر غائبانہ طور پر کچھ ایسا رعب طاری تھا۔ گو میرے ایک دو دوست اُن کے ہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے اور مجھ سے کہتے بھی تھے کہ آؤ تمہیں بھی لے چلیں لیکن مَیں نے ہر دفعہ یہ وہ کہہ کر ٹال دیا۔ ایک تو مَیں فطری طور پر اختلاط سے کتراتا ہُوں اور دُوسرے شاید

میں یہ سمجھتا تھا کہ شاگرد بھی اُستاد کی طرح ہو گا۔ اسلئے اپنے پُرانے تجربے کو کیوں دُہرایا جائے۔ لیکن چونکہ میرے دوست میرے انتہائی شوق سے بے خبر نہ تھے اسلئے ایک دن وہ مجھے کھینچ کر لے ہی گئے سڑک والے گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی میرے دل کی دھڑکن ذرا تیز ہو گئی۔ آگے جا کر میرے دوست نے اُن کے ملازم علی بخش سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو اطلاع کر دو۔ اُس نے واپس آ کر کہا کہ چلے جایئے۔ ہم برآمدے میں سے ہوتے ہوئے۔ دائیں جانب ایک کمرے میں داخل ہوئے اور کرُسیوں پر بیٹھ گئے۔

مَیں نے اپنے ذہن میں اقبالؔ کی ایک خاص شبیہ تجویز کر رکھی تھی۔ مَیں سمجھتا تھا کہ وہ نہایت پُر ہیبت شخص ہو گا۔ اس کی پیشانی پر ہمیشہ غصے کی وجہ سے شکن رہتے ہونگے۔ اقبالؔ سے ہمکلام ہونا ہر ایک کے بس کی بات نہ ہوتی ہو گی۔ کیونکہ اس سے تو وہی گفتگو کرے جس کی علمیت اور ذہانت بہت بلند پائے کی ہو۔ ورنہ جب کبھی اقبالؔ نے کسی کے منطقی استدلال میں کوئی خامی دیکھی۔ جھٹ وہیں ڈانٹ بتا دی۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس نکلی۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی اقبالؔ نے مجھے بظاہر سرسری طور پر ایک نظر سے دیکھا۔ لیکن مجھے یہ محسوس ہُوا کہ ان کی نگاہ میرے رُوح و قلب کی گہرائیوں تک سرایت کر گئی ہے اور انہوں نے میری شخصیّت کا ایسا مکمل جائزہ لے لیا ہے کہ ان سے کچھ مخفی نہیں رہا۔ ہم کرُسیوں پر بیٹھ گئے۔ فروری کے آخری دن تھے۔ ہلکی ہلکی سردی تھی علامہ اقبالؔ ایک بادامی رنگ کا دُھسّہ اوڑھے۔ حُقّے کی نَے مُنہ میں لئے بستر پر گُچھا مُچھا بنے تکیے پر ٹیک لگائے آدھے لیٹے آدھے بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کی بے تکلفی اور لااُبالی پن دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ مَیں نے دیکھا کہ اقبالؔ محض انسان نہیں مافوق البشر ہیں۔ کچھ اور لوگ بھی

بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا انداز بھی بے تکلفانہ تھا۔ ہمارے داخل ہونے کے کچھ دیر بعد تک خاموشی رہی۔ پھر کسی نے کچھ بات کی۔ میرے دوست نے اپنی رائے ظاہر کی۔ اقبالؔ نے کچھ کہا۔ اوروں نے سلسلہ کلام کو جاری رکھا۔ میں اب بھول گیا ہوں کہ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ لیکن آخر میں Relativity اور Gravity کا ذکر چھڑ گیا۔ اوروں کو اس طرح آزادانہ گفتگو کرتے ہوئے دیکھ کر میری بھی ہمّت بڑھی اور مَیں نے بھی ایک دو باتیں کہہ دیں۔ علامہ اقبالؔ ہر ایک کو نہایت توجہ سے سُنتے۔ زیادہ تر خاموش رہتے۔ لیکن جب کبھی مناسب سمجھتے کچھ کہہ بھی دیتے۔ یا جب کبھی کوئی ان سے براہ راست سوال کرتا۔ تو اسکا نہایت سوچ سمجھ اور متانت سے جواب دیتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ وہ فرما رہے ہیں نہایت غور و خوص کا نتیجہ ہے اور ان کا انداز بیان اسقدر موثر اور دلکش تھا کہ پیچ در پیچ مسائل بھی آسانی سے ذہن نشین ہو جاتے۔

اس مختصر سی صحبت کے بعد مجھے بوجوہ ایک طویل عرصہ تک اقبالؔ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقعہ نہ ملا۔ پانچ چھ سال کے بعد میں اسلامیہ کالج لاہور میں ملازم ہُوا اور یہاں پروفیسر ڈاکٹر سعید اللہ اور پروفیسر حمید احمد خاں سے دوستانہ تعلقات کی بنا پڑی۔ ایک دفعہ (یہ اقبالؔ کی وفات سے تقریباً ایک سال پیشتر کا ذکر ہے) میرے دوستوں نے کہا کہ چلو آج اقبالؔ کے ہاں چلیں۔ مَیں نے یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ آپ تو اکثر ان کے ہاں جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ میں کبھی نہیں گیا۔ اور وہ مجھے جانتے نہیں۔ اس لئے میرا آپ کے ہمراہ جانا مناسب نہیں۔ در اصل اس دفعہ بھی میری جبلی کم آمیزی مانع ہُوئی۔ مگر میرے دوستوں نے کہا کہ گو ہم کئی دفعہ اقبالؔ کے ہاں گئے ہیں یہ ضرور نہیں کہ وہ ہمیں جانتے ہی ہوں۔ وہاں دیوانِ عام ہوتا ہے۔ ہر کس و ناکس کو بے دھڑک

آنے جانے کی اجازت ہے۔ تم بھی چلے چلو۔ چنانچہ میں اُن کے ہمراہ ہولیا۔

اب اقبال اپنی میوروڈ والی کوٹھی میں رہتے تھے۔ اس سڑک پر سے بھی میں کئی دفعہ گزرا تھا۔ اور اس کوٹھی کو دورانِ تعمیر میں اور تکمیل کے بعد کئی دفعہ دیکھا تھا۔ اس کوٹھی کی طرزِ تعمیر سے مجھے ہمیشہ مایوسی ہوئی ہے سب سے پہلے رواق کے ستونوں پر نظر پڑتی ہے۔ یہ ستون پست قد۔ نازک اور سبک سے ہیں۔ اور انکی کرسی مقابلۃً بھاری ہونے کے باعث غیر متناسب معلوم ہوتی ہے۔ صحن میں دائیں اور بائیں جانب جو کمرے بنے ہوئے ہیں۔ وہ بھی قطعاً ناموزوں ہیں۔ کوٹھی کے کمروں کی چھتیں بہت نیچی ہیں۔ اگر عمارت اقبال کے پسند ہوتی تو اس میں وسعت۔ رفعت اور جبروت کی خصوصیات ہونا چاہئیں تھیں۔ لیکن موجودہ عمارت اسکے بالکل برعکس ہے۔ اس میں حسن ضرور ہے لیکن بیگماتی۔ سُننے میں آیا ہے کہ اقبال کے عقیدتمندوں میں سے چند مقتدر حضرات اُن کے مزار پر اقبال کے شایانِ شان ایک مقبرہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اس دفعہ یہ کام کسی ایسے ماہرِ فن کے سپرد کرنا چاہیئے۔ جسنے اقبال کے کلام کا بغور مطالعہ کیا ہوا ہو۔ اور جو انکی شخصیت سے بخوبی واقف ہو۔

الغرض ہم "جاوید منزل" پر پہنچے۔ علی بخش سے کہا گیا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ہمارا اسلام عرض کردو۔ ادھر سے وہی جواب آیا کہ آجایئے۔ ہم ڈرائینگ رُوم میں سے گزر کر بائیں پہلو والے کمرے میں داخل ہوئے۔ جس میں جناب علامہ اپنے مخصوص انداز میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ پلنگ کے پاس تین کرسیاں پڑی تھیں۔ ہم السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گئے۔ اقبال کی آواز بہت کمزور تھی اور دیرینہ علالت کی وجہ سے جسم نحیف و نزار تھا۔ لیکن نیم وا آنکھوں میں وہی چمک اور نگاہوں میں وہی تیزی تھی جو میں ابھی تک نہیں بھُولا تھا۔ اور چہرے پر افسردگی یا تکلیف کا نام ونشان نہ تھا۔ ہم نے احوال پُرسی کی

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اب پہلے سے بہتر ہوں۔ حکیم نابینا صاحب کی دوا استعمال کرتا ہوں۔ بہت کچھ افاقہ ہے۔ اس سے میں یہ سمجھا کہ اگر آپ کی صحت کا اسوقت یہ عالم ہے تو اس سے پیشتر تو آپ کی حالت بالکل خطرناک صورت اختیار کر گئی ہوگی۔ لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت اقبال استقدر خوش امید واقع ہوئے ہیں۔ کہ گو درحقیقت ان کی حالت روز بروز روبہ تنزل ہی کیوں نہ ہو۔ ان کو ہمیشہ یقین ہوتا تھا کہ میں بتدریج روبصحت ہوں۔ نہ معلوم یہ خیال حکیموں کے نزدیک درست ہے یا نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ اقبال کی مرگ انگن رجائیت ہی تھی۔ جس کی بدولت وہ اتنی دیر بیماری کا مقابلہ کرسکے۔ ورنہ اگر کوئی اور شخص انہی موذی امراض میں مبتلا ہوتا۔ تو وہ کبھی کا جاں بحق ہو گیا ہوتا۔ درحقیقت لوگ بھی اقبال کی طبیعت سے واقف ہو چکے تھے۔ ان کی حیرت انگیز تابِ مقاومت کے پیشِ نظر سب جانتے تھے کہ باوجود پے در پے حملوں کے موت ان پر غلبہ نہیں پاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ گو وہ عرصہ دراز تک بیمار رہے انکی وفات کی خبر بالکل غیر متوقع تھی۔

اس ملاقات کے بعد مجھے کئی دفعہ اقبال کی قدمبوسی کا شرف حاصل ہوا ہے۔ لیکن میں ہمیشہ اپنے دوستوں کی معیت میں گیا ہوں۔ اکیلا جانے کی جرأت میں آخر تک نہیں کرسکا۔

اب میں اقبال

(۱) بینائی کا جاتے رہنا۔

(۲) یونانی طب۔ کالی عینک۔ دواؤں کا تیار کرنا۔

(۳) تصوف۔ ریواڑی والے حکیم۔ لوٹے کا قصہ۔

کے صرف چند ایسے اقوال بیان کروں گا۔ جو کسی نہ کسی وجہ سے میرے ذہن پر دیرپا نقش چھوڑ

گئے ہیں۔

ایک دفعہ ہم تینوں دوست اُن کی خدمت میں حاضر ہُوئے۔ اندر جانے کی اجازت پا کر ہم علامہ موصوف کے کمرے میں داخل ہُوئے اور السلام علیکم کہہ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اقبال نے پوچھا "کون صاحب ہیں" حمید احمد خاں نے ہم تینوں کے نام بتائے اور کہا کہ ہم اسلامیہ کالج سے آئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ فرمانے لگے کہ مجھے تمہارا نام دریافت کرنیکی ضرورت یُوں محسوس ہُوئی کہ میری بینائی روز بہ روز کمزور ہو رہی ہے۔ چنانچہ اب میں آسانی سے کسی کی صُورت بھی نہیں پہچان سکتا۔ اِس پر مَیں نے اظہارِ تاسف کرتے ہُوئے کہا کہ آپ کی طویل علالت کے دوران میں مطالعہ ہی ایک ایسا مشغلہ تھا۔ جو آپ کی تسکین کا باعث ہو سکتا تھا۔ افسوس کہ اب آپ اس سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔ فرمانے لگے کہ نہیں یہ کچھ ایسا نقصان نہیں۔ دیکھئے نا جب سے مَیں پڑھنے کے قابل نہیں رہا۔ میرا حافظہ زیادہ قوی اور میری قوتِ فکر زیادہ تیز ہو گئی ہے اب محض غور و فکر سے مجھے وہ وہ نکات سُوجھتے ہیں کہ بہت سا مطالعہ کرنے کے بعد بھی نہ سوجھتے تھے۔ پھر کہنے لگے۔ کہ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میری ایک آنکھ کی بینائی بچپن میں ہی کسی بے احتیاطی کی وجہ سے زائل ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں اب تک صرف ایک آنکھ سے کام لیتا رہا ہُوں۔ اور مجھے کبھی کوئی کمی محسوس نہیں ہُوئی اب یہ آنکھ بھی جواب دے رہی ہے۔ ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ اس کو بالکل کوئی ضرر نہیں پہنچا۔ صرف موتیا اُتر رہا ہے۔ جب پک جائیگا تو اپریشن سے آنکھ دُرست ہو جائے گی۔ فی الحال مجھے کالی عینک استعمال کرنے کی ہدایت کی گئی ہے تاکہ آنکھ پر زیادہ زور نہ پڑے۔ دریافت کرنے پر مجھے معلوم ہُوا ہے کہ شیشے میں کالا رنگ جست اور سُرمے کی آمیزش سے دیا جاتا ہے۔ آپ جانتے

ہیں۔ کہ ہمارے سُرمے میں بھی یہی دو اجزا ہوتے ہیں۔ چنانچہ میرے خیال میں کالی عینک کا پہننا ویسا ہی اثر رکھتا ہے جیسے آنکھوں میں سُرمے کا استعمال۔ مَیں نے کہا کہ دونو کا اثر ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شیشہ تو ہر وقت آنکھ کے سامنے رہتا ہے۔ اس لئے روشنی کی شعاعیں اس میں سے چھن کر آتی ہیں۔ لیکن سُرمہ صرف پپوٹوں میں رہ سکتا ہے۔ فرمایا کہ نہیں۔ ہر دفعہ آنکھ جھپکنے سے سُرمے کی ایک نہایت باریک جھلی آنکھ پر تن جاتی ہے اور یہ وہی کام دیتی ہے۔ جو کالی عینک۔ در اصل علامہ اقبال یُونانی طب کے بہت معتقد تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ طریقہ علاج نہایت مجرب ہے۔ اس کے زیادہ مقبول نہ ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کی کوئی معیاری حیثیت نہیں۔ اگر یونانی دوائیں ویسی ہی معیاری ہوں۔ جیسی ایلو پیتھی کی تو یونانی طب کو بہت جلد فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔ موجودہ صُورت میں دواؤں اور مرکبات کا گھر میں تیار کرنا بہت بڑی دقت کا باعث ہوتا ہے۔

علامہ اقبال کی طبیعت میں عقلیت کا پہلو بہت نمایاں تھا۔ لیکن وہ عقل کی کورانہ تقلید نہ کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ عشق یا وجدان ہی ایک ایسا ملکہ ہے۔ جس کی بدولت موجودات کے تمام اسرار کا انکشاف ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اکثر صُوفیائے کرام کی روایات بیان کیا کرتے تھے۔ جن سے انکے اس رجحان کا ثبوت ملتا تھا۔

ایک دفعہ ہم تینوں دوست حاضرِ خدمت ہوئے۔ علامہ موصوف ڈرائینگ روم میں تشریف فرما تھے اور بہت سے لوگ موجود تھے۔ گفتگو جاری تھی۔ جس میں ادب سے نمایاں حصہ ایک حکیم صاحب لے رہے تھے جو ریواڑی سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ یہ حکیم صاحب نہایت خوش اعتقاد واقع ہوئے تھے اور طرح طرح کے ناممکن الوقوع قصے بیان کر رہے تھے۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ مَیں نے اپنی آنکھوں سے

دیکھا ہے کہ ایک خدا رسیدہ بزرگ نے اپنے ایک مرید کے لئے دُعا کی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ موخر الذکر کے مٹکے اشرفیوں سے بھرے رہتے تھے۔ یہ اور ایسی ہی اور باتیں سُنکر حاضرین حکیم صاحب کی سادہ لوحی پر مسکرا رہے تھے۔ لیکن حکیم صاحب کو نہ لوگوں کے تبسم زیرِ لب کا احساس ہُوا اور نہ ان کا یقین متزلزل ہُوا۔ اس پر علامہ اقبال نے بھی ایک واقعہ بیان کیا۔ فرمانے لگے کہ ایک دفعہ بابا فرید شکر گنج کا ایک مُریدان کی خدمت میں قدمبوسی کے لیے حاضر ہُوا۔ حضرت کے ہاتھ میں اس وقت ایک مٹی کا لوٹا تھا اور آپ وضو کر رہے تھے۔ اتنے میں انھوں نے لوٹے کو اس طرح پھینک دیا۔ جیسے کسی پر ڈھیلے مارتے ہیں لیکن بجائے اس کے کہ لوٹا تھوڑی دُور جا کر زمین پر گر پڑے وہ ہوا میں غائب ہو گیا۔ بہت دنوں کے بعد حضرت کے مُریدوں کا ایک قافلہ آپ کی خدمت میں حاضر ہُوا اور آتے ہی قافلہ نے آپ کے سامنے مٹی کے چند ٹھیکرے پیش کئے۔ مُرید مذکور نے موقعہ پاکر قافلے والوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم ایران سے آ رہے تھے اور بلوچستان میں سفر کر رہے تھے کہ راستے میں دفعتہً ایک شیر نے ہم پر حملہ کیا۔ ہم نے بارگاہِ الٰہی میں سلامتی کی دُعا کی جس کا فوراً یہ نتیجہ ہُوا کہ ایک مٹی کا لوٹا شیر کے سر پر پڑا اور وہ بھاگ گیا۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ یہ ہمارے حضرت کی کرمفرمائی ہے۔ لہٰذا ان ٹھیکروں کو تبرک جان کر ہم ساتھ لے آئے اور یہاں پہنچکر حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اس پر حاضرین میں سے کسی نے پوچھا کہ طبعی حوادث میں سے زمانے کا عنصر کیونکر خارج ہو سکتا ہے۔ دیگر اعتراضات سے قطع نظر یہ قرین قیاس نہیں۔ کہ لوٹا پاکپٹن میں پھینکا جائے اور وہ اس وقت سینکڑوں میل کے فاصلے پر بلوچستان میں ایک شیر کے سر پر جا پڑے۔ جواب میں حاضرین میں سے ایک اور صاحب نے کہا کہ جدید ترین طبعیات کی رو سے ایک جسم کی دو حالتوں میں بعدِ مکانی ہونے کے باوجود ان

میں بعدِ زمانی ہونا لازم نہیں۔اس کا ثبوت جوہر کی ساخت اور اس کے اجزائے ترکیبی کی حرکات سے ملتا ہے۔جوہر کی ساخت نظامِ شمسی کے مانند ہے مرکز میں ایک Proton ہوتا ہے۔جس کے گرد جوہر کی نوعیت کے مطابق ایک یا ایک سے زیادہ برقیے۔ مخصوص مداروں میں گردش کرتے ہیں اب مشاہدے میں آیا ہے کہ کبھی ایک برقیہ اپنے مدار کو چھوڑ کر ایک نئے مدار میں گھومنے لگتا ہے۔ اور اس سے متعلق دو حیرت انگیز انکشافات ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اس تغیر کی کوئی علت نہیں ہوتی۔یعنی جدید طبیعیات کے نزدیک علت و معلول کا قانون اٹل نہیں۔ دوم یہ کہ برقیے کا ایک مدار سے دوسرے مدار تک جست کرنا ہم وقت حادثات ہیں۔یعنی مسافتِ مکانی کے لئے مرورِ زمان لازم نہیں۔علامہ اقبال نے اس تقریر کو بہت توجہ سے سُنا۔اس پر حاضرین کے مابین تھوڑی بہت بحث بھی ہوئی۔لیکن بعد ازاں گفتگو کا رُخ بدل گیا۔اور ہم کچھ دیر کے بعد رخصت لے کر چلے آئے۔

اب اقبالؔ اس دارِ فانی سے چل بسے ہیں۔ان کی وفات ایک ایسا نقصان ہے جو قطعاً ناقابلِ تلافی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اقبال اپنے کلام کی بدولت زندہ جاوید ہیں اور ایسی عظیم الشان ہستی کی کبھی موت نہیں ہوسکتی۔ یہ نظریہ اس کلیے پر مبنی ہے کہ ایک شاعر کی نظم اس کی مکمل شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ مثلاً اگر ہمیں شیکسپیئر کی سوانح حیات کا بالتفصیل علم نہیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔کیونکہ شیکسپیئر کی ہمہ گیر شخصیت اس کے ڈراموں میں جلوہ گر ہے۔اسی طرح شیلے کے کلام میں اس کی بے باک اور آزاد طبیعت واضح طور پر نمودار ہوتی ہے۔ لیکن اقبالؔ کا کلام اس کلیے کی استثنا ہے۔اقبال کی شخصیت کے دو امتیازی پہلو تھے جن کے درمیان بہت بڑا فرق تھا۔اپنے کلام میں اقبال فوق البشر کی حیثیت سے رونما ہوتے ہیں۔ان کا بلند پایہ کلام اس قدر بلند ہے کہ ان کا تخیل اپنے پرواز کی ابتدا عرشِ بریں سے کرتا ہے

ان کے فکر کی رفعتوں کی انتہا اور گہرائیوں کی تہ تک پہنچنا شاید کسی کے بس کی بات ہو۔ بعض دفعہ تو ان کا کلام فلسفیانہ دقائق سے پُر ہونے کی وجہ سے ہمارے فہم سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اقبال کے شعر سے ہر شخص حتیٰ المقدور استفادہ کر سکتا ہے۔ لیکن محض ان کی نظم پڑھنے سے۔ اب وہ ذاتی تعلق پیدا نہیں ہو سکتا جو ان کی زندگی میں ممکن تھا۔ ان سے تبادلۂ خیالات کے یہ مواقع اسقدر بیش قیمت تھے کہ اب ان کی وفات کے بعد یہ کمی ہرگز پوری نہیں ہو سکتی۔

فوق البشریت کے مقابلے میں اقبالؔ کی کیفیت کا دُوسرا رُخ اُن کی بشریت ہے۔ اقبالؔ کی سادگی اور ان کی ظرافت دو ایسے عنصر ہیں جو ان کے کلام میں مشکل سے ملتے ہیں۔ ان کا فیض بلا امتیاز مذہب و ملت ہر شخص پر عام تھا۔ جس کا جی چاہتا ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ جب تک جی چاہتا۔ ان کی صحبت سے مستفیض ہوتا۔ اور جب جی چاہتا چلا آتا۔ اقبالؔ ہر ایک کی گفتگو میں پوری توجہ اور انہماک سے حصہ لیتے اور ہر ایک کی ذہنی سطح کے مطابق بات کرتے۔ جب کبھی کسی نے علی بخش سے جا کر کہا کہ ڈاکٹر صاحب سے اطلاع کر دو۔ اندر سے ہمیشہ یہی جواب آیا کہ آ جائیے۔ اقبالؔ نے کبھی اشارے یا کنائے سے کسی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اب وقت زیادہ ہو گیا ہے۔ آپ تشریف لے جائیے یا یہ کہ میں آپ کی بے ربط گفتگو سے تنگ آ گیا ہوں۔ اب ختم کیجیے۔ میرا اور میرے دوستوں کا دستور تھا کہ جب کبھی کوئی ایسا علمی مسئلہ ہمارے در پیش ہوتا جس کا حل ہمیں نہ سُوجھتا تو ہم اقبالؔ کے پاس چلے جایا کرتے۔ ان سے احوال پُرسی کے بعد ہم سوال پُوچھتے۔ اور ہم ہر دفعہ یہ دیکھتے کہ ہماری مشکل کا حل اُن کے پاس بجا تُلا موجود ہے۔ ہم ان سے جس کسی موضوع پر گفتگو کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اقبال تمام عمر اسی ایک موضوع پر غور و خوص کرتے رہے۔ اور اس کا کوئی باریک سے باریک پہلو بھی اُن کی نکتہ شناس نظر سے پوشیدہ نہیں

دُنیا کے مصائب اور مشکلات کا بہترین علاج اقبال کی صحبت تھی۔ اُن کی طبیعت میں ایک قسم کی غیر مغلوب Invincible رجائیت تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ تا دمِ آخر خندہ جبیں رہے کیوں نہ ہو۔ آخر دُنیا و مافیہا بلکہ دنیا و مافیہا کی کوئی بھی طاقت تھی جو اُن کے زیرنگیں نہ تھی۔ وہ صحیح معنوں میں فقیری میں امیری کرتے تھے۔ یہ قول کہ علم قدرت ہے بالکل درست ہے۔ اقبال کی حکومت تمام کائنات پر چھا دی تھی۔ انھوں نے تمام مظہر کو ایک ایسے مکمل اور پختہ نظام میں منظم کر رکھا تھا۔ کہ اس کائنات کی بڑی سے بڑی طاقت بھی سرتابی کی تاب نہ لا سکتی تھی۔ اب اگر ایسا شخص خوش امید نہ ہوگا تو اور کون ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی طبیعت میں شگفتگی اور ظرافت ضرور ہونی چاہیئے۔

اقبال کبھی اس خیال سے بات نہیں کرتے تھے کہ میری زبان سے ہمیشہ گوہر شہوار گرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ گو ان کے پاس بڑے بڑے صاحب قلم اور صاحب طرز لوگ جایا کرتے ان کا کوئی BOSWELL نہ بنا۔ اقبال میں صحیح شانِ قلندری نمایاں تھی۔ وہ اپنے علم کے انمول موتیوں کو اس طرح بے دریغ لٹایا کرتے تھے۔ جیسے اُن کے نزدیک اُن کی کوئی قدر ہی نہ تھی۔ لہذا ہر شخص جس نے ان کے علم سے خوشہ چینی کی ہے اُن کی وفات حسرتِ آیات کو اپنا ذاتی نقصان تصور کرتا ہے۔ اور اُن کا کلام موجود ہونے کے باوجود نوحہ خواں ہے ؎

چند مُلاقاتیں

سیّد الطاف حسین ایم ۔ اے

اکثر لوگوں کی طرح میں بھی جب پریشان کُن حالات میں محصور ہو جاؤں تو تسکینِ خاطر کے لیے عہدِ ماضی کے چند زرّیں ایّام کی یاد میں پناہ لے لیا کرتا ہُوں۔ میری مختصر گذشتہ زندگی کے بہترین واقعات جنہیں میں اپنے لئے سرمایۂ فخر و ناز سمجھتا ہُوں اور جنکی یاد متاعِ زندگی بن کر عمر بھر میرے دل میں آباد رہے گی۔ وہ چند مختصر ملاقاتیں ہیں۔ جو مجھے علاّمہ مرحوم سے نصیب ہُوئیں۔ مجھے اس بات کا دُکھ ہے کہ اُن کی زیارت کے مواقع مجھے صرف طالب علمی کے زمانہ میں میسّر ہُوئے جب مَیں اُن کی صحبتِ بابرکت سے کما حقہ استفادہ کرنے کے قابل نہ تھا مگر جب مجھ میں اُن سے بات کرنے اور اُن کی بات سمجھنے کی صلاحیّت پیدا ہونے لگی

تو وہ چل بسے ؂

اے بسا آرزو کہ خاک شُدہ

ملاقاتیں مختصر اور پریشان سی ہیں۔ یُوں تو انہیں کئی مرتبہ بیک وقت نگوبازگشت کے سامنے ایک داستان کے مختلف ٹکڑوں کی صُورت میں لا چکا ہُوں مگر انہیں سپردِ قلم کر صفحۂ قرطاس پر یکجا کرنے کا خیال علّامہ مرحوم کے انتقال کے بعد محض چند احباب کی تحریک پر پیدا ہُوا۔ عدم فرصت کے سبب یہ خیال ایک طویل عرصہ تک ذہنی حدود سے باہر نہ آسکا۔ مگر پھر جی میں آئی کہ انتظارِ فرصت میں اگر ساری عمر بھی ضائع ہو جائے تو بعید نہیں۔ اس کام سے جتنی جلدی ممکن ہو فارغ ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ آج گویا اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ؂

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو

مدّت ہُوئی ہے دعوتِ مژگاں کئے ہُوئے

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مَیں جب گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہُوا تو شکوہ کے اشعار وردِ زباں تھے۔ کالج کی کتابیں پڑھتے پڑھتے اگر شکوہ شروع کر دیتا تو دل و دماغ پر ایک بیخودی سی طاری ہو جاتی جس سے ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد بیدار ہو کر معلوم کیا کرتا کہ کتابیں میز پر دھری کی دھری ہیں۔ ان دنوں ہر وقت دُھن سی لگی رہتی کہ ان بلند پایہ اشعار کے مُصنّف کی زیارت نصیب ہو۔ چند احباب کی منّت سماجت کی کہ اگر اُن کی رسائی اقبال تک ہو تو کبھی نہ کبھی مجھے اپنے ہمراہ ضرور لے جائیں۔ ایک صاحب نے رضامندی کا اظہار تو کیا مگر نہ معلوم کس خیال سے بہت لیت و لعل کرتے رہے۔ آخر پُورے نو مہینے ٹالم ٹول کے بعد وہ مجھے اُس قلبۂ عالیہ تک لے کر پہنچے۔

جس کے شوقِ دید میں میں ایک عرصہ سے بے قرار تھا۔ غالباً جولائی کے اواخر کی چاندنی رات تھی ڈاکٹر صاحب میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کے صحن میں ایک پلنگ پر تہمد اور سفید بنیان ذیب تن کئے لیٹے ہوئے تھے۔ ایک ملازم شانے داب رہا تھا۔ کوٹھی کی ایک جانب سرکنڈوں کی قطار تھی۔ جن کا سایہ صحن کے سامنے کافی دُور تک پڑ رہا تھا۔ روشنی وغیرہ کوئی نہ تھی۔ چاندنی رات کا سماں۔ سرکنڈوں کا خاموش دردراز سایہ۔ مکان کی "پُر سکوتی" و "بے چراغی" اور اُس عظیم الشان شخصیت کی انتہائی سادگی جو میری دنیائے عقیدت کے اوجِ ثریا پر مقیم تھی۔ ایک عجیب منظر تھا جس کی کیفیت آج تک دل میں باقی ہے مگر کبھی محتاجِ الفاظ نہیں ہوئی۔ جو صاحب میرے ہمراہ تھے انہوں نے ایک ملازم کے ذریعہ اپنی آمد کی خبر بھیجی۔ ڈاکٹر صاحب نے نام سُنتے ہی ہمیں بُلا لیا چنانچہ ہم جا کر اور السلام علیکم کہہ کر اُن کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میری آنکھوں کو ان کے چہرے کی زیارت نصیب ہوئی۔ میں ہمہ تن دید بن کر اس محویت سے ان کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے تھا۔ گویا کسی دیرینہ خواب کی تعبیر دیکھ رہا ہوں۔ قریباً ہر دو منٹ کے بعد ایک لمبی اور گہری سانس لیتے تھے۔ جس سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دودِ ہیجاں کے انبار کا ایک بارِ ثقیل سینے پر دھرا ہے جس کی تخفیف چاہتے ہیں۔ کبھی کبھی پاؤں کو چارپائی پر اوپر نیچے حرکت دیتے تو بستر پر سلوٹیں پڑ جاتیں۔ پیشانی اور رخسار اُبھرے ہوئے تھے، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور ٹھوڑی کے نچلے حصّے کا گوشت ڈھلک رہا تھا۔ مزاج پُرسی کے بعد میرے محترم دوست نے ڈاکٹر صاحب سے میرا اس طرح تعارف کرایا کہ یہ گورنمنٹ کالج کے ایک طالب علم ہیں اور آپ کے بہت مدّاح ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک لحظہ میری طرف غور سے دیکھا۔ باوجودیکہ سر سے شانوں تک اُن کا جسم نسبتاً اندھیرے میں تھا۔ اُن کی آنکھوں میں جو چمک اُس وقت نمودار ہوئی مجھے روزِ روشن کی طرح واضح

طور پر نظر آتی اور آج تک میری نگاہوں میں محفوظ ہے۔ اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ اپنے کلام کے ایک مداح کو دیکھ کر انہیں مسرت ہوتی کیونکہ ان کی آنکھیں قدرتی طور پر چمکدار تھیں بالخصوص جب کسی چیز کو آنکھ پھیر کر دیکھا کرتے تو یہ چمک نمایاں طور پر نظر آیا کرتی میری طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے "کونسی جماعت میں پڑھا کرتے ہو؟" میں نے عرض کی "سیکنڈ ایئر کا امتحان دے چکا ہوں اور تھرڈ ایئر میں داخل ہونے کا ارادہ ہے"۔ "مضامین کونسے ہیں؟" میں نے کہا "عربی اور اے کورس کی صلاح ہے" فرمایا "اے کورس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" "اے کورس ریاضی کا ایک مضمون ہے"۔ کہنے لگے "بی۔اے وغیرہ میں ریاضی تو غالباً چند مخصوص قسم کے سوالات تک محدود ہے جن سے اُس کے چند موٹے موٹے اصولوں کو طلباء کے ذہن نشین کرانا مقصود ہوتا ہے۔ البتہ ریاضیٔ اعلیٰ کے لیے تخیل کی ضرورت ہے تم اکنامکس کیوں نہیں لے لیتے؟" ان دنوں مجھے علم اقتصادیات سے کچھ دلچسپی نہ تھی (اگرچہ آج اس کی تحصیل کو ترستا ہوں) چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی تجویز مجھے پسند نہ آئی اور میں خاموش رہا۔ پھر فرمایا "تعلیم سے کچھ مقصد پیشِ نظر ہے؟" میں نے عرض کیا "فی الحال کچھ نہیں" میرے محترم دوست سے فرمانے لگے۔ "ہمارے نوجوان کسی مقصد کو سامنے رکھے بغیر بے تکے مضامین لے لیتے ہیں" اس گفتگو کا مجھ پر اتنا اثر ضرور ہوا کہ میں نے بی۔اے میں اے کورس کی بجائے تاریخ لے لی۔ اس کے بعد روئے سخن دیگر عنوانات کی طرف منتقل ہوا۔ کچھ دیر پنجاب کے چند بڑے بڑے شہروں کے آباد ہونے کی باتیں ہوتی رہیں اُسکے بعد بہ سبیل تذکرہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک ہم جماعت کا ذکر کرتے ہوئے کہا "کہ وہ ہر سال امتحان میں ناکامی سے دوچار ہوا کرتا تھا۔ جس طرح ملاح ہر مرتبہ مسافروں کو دریا پار کرنے کے بعد واپس کنارے پر آجاتا ہے اُس کا بھی یہی حال تھا۔ چنانچہ ہم اُسے ملاح کے نام سے یاد کیا کرتے تھے اور اکثر بطور تمسخر اُسے کہا کرتے تھے کہ بھئی تم نے یونیورسٹی کا سالانہ وظیفہ مقرر کر رکھا ہے"۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے

ایک مولوی صاحب کا قصہ سُنایا۔ جن سے چند روز ہوئے سیالکوٹ میں اُن کی مُلاقات ہو چکی تھی۔ انکے اصلی الفاظ یاد نہیں مگر صُورتِ حالات یہ تھی کہ مولوی صاحب کو ایک پردہ نشین لڑکی کے والدین نے حسنِ ظن میں گرفتار ہو کر لڑکی کو اقلیدس پڑھانے کے لئے معلّم مقرر کیا۔ تعلیم و تعلّم کا انداز قدرے مضحکہ انگیز تھا یعنی مولوی صاحب اور انکی شاگرد و رشیدہ کے درمیان پردہ حائل رہتا اور مولوی صاحب پردے کے نیچے سے ہاتھ بڑھا کر سلیٹ یا کاغذ پر مستطیلوں اور مربعوں کو کھینچ کر ان کے رقبوں کے قواعد لڑکی کو سکھایا کرتے چند روز کے بعد مولوی صاحب نے ریاضی کے دقیق نکات و رموز کی تعلیم میں پردے کو سدِّ راہ سمجھا۔ آخر پردہ تھا "اُٹھ گیا" اور مولوی صاحب اُستاد و شاگرد کے تعلّقات کی محدود اور بے کیف دُنیا سے نکل کر عشق و تعشق کے بحر ناپیدا کنار کی غوّاصی پر کمربستہ ہوئے۔ بات "اُڑ گئی" مولوی صاحب کی تشہیر ہُوئی اور معاملہ درِ عدالت تک پہنچا۔ ان دنوں مقدمہ چل رہا تھا۔ لہذا قصہ یہیں ختم ہوا۔ مولوی صاحب کی وارفتگی پر قدرے تعجّب کرتے ہُوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "میں نے لڑکی کو دیکھا ہُوا ہے۔ کوئی خاص خوبصورت نہیں"۔ مجھے ان الفاظ میں ایک ہلکا سا شبابی رنگ نظر آیا اور اُن کے تلفّظ میں کسی کے شبابِ رفتہ کی صدائے بازگشت سُنائی دیتی معلوم ہُوئی۔ علاوہ ازیں حسنِ معصومانہ انداز میں ڈاکٹر صاحب نے ان الفاظ کو ادا کیا۔ اُس سے میرے دل میں گُدگُدی سی پیدا ہُوئی۔ مگر میں مسکراہٹ تک کو ضبط کر کے بیٹھا رہا۔ آج تنہائی میں کبھی یہ فقرہ یاد آجائے تو مسکرا لیا کرتا ہُوں۔ جہاں تک یاد ہے پہلی ملاقات میں اور کوئی بات قابلِ ذکر نہ ہُوئی اور ہم اجازت لیکر واپس چلے آئے۔ میں اگرچہ آج بھی سن رسیدہ نہیں ہوں مگر اُن دنوں بالکل بچہ تھا اور میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس شعر و سخن کے علاوہ اور کسی قسم کی باتیں نہ ہونگی۔ لہذا پہلی مرتبہ اُن سے ملنے کے بعد میں مایوس سا ہُوا اور دل میں کہا کہ بجائے شاعر اقبال کے بیرسٹر اقبال سے ملاقات ہُوئی۔ یہ بعد

میں معلوم ہوا کہ ان کے اشعار ان کے جگر پارے ہیں اور کسی متشاعر کے کلام کی طرح لوگوں کی تفریح طبع کا سامان نہیں۔ اور اُن سے مزید واقفیت نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ وہ کسی علم خام رکھنے والے کی طرح نمائش پسند نہیں کہ جن صفات کے سبب دُنیا اُن کی متعقد ہو وہ ان کا مظاہرہ ملنے والوں پر خواہ مخواہ کرتے رہیں۔ یہ راز بھی بعد میں آشکار ہُوا کہ نظم و نثر کے امتیازات سے درحقیقت انہیں خاص سروکار نہیں وہ تو چونکہ قدرت کو منظور ہے کہ اور لوگوں کو بھی ان کے سانچے میں ڈھالا جائے لہذا الفاظ ان کے مُنہ سے ایک عجیب دلکش و مؤثر انداز میں نکلتے ہیں۔ جسے دُنیا اپنی اصطلاح میں شعر کے نام سے موسوم کرتی ہے۔ نیز ان سے مل کر مَیں نے یہ بھی محسُوس کیا کہ جبتک کوئی شخص شعر و شاعری کی بحث میں انہیں زبردستی گھسیٹ کر نہ لے آئے وہ اس سے حتی الامکان اجتناب کیا کرتے۔ اس موقع پر اپنے ایک عزیز کا قصہ یاد آگیا۔ وہ سُناتے تھے کہ ایک مرتبہ یوپی کے رہنے والے دو شاعری زدہ اصحاب ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرنے کیلئے گئے۔ علیک سلیک کے بعد مزاج پُرسی ہوئی اور پھر کچھ دیر تک دونو جانب خاموشی طاری رہی۔ کچھُ انتظار کے بعد جب اُن میں سے ایک کو شاعری کے پھپھولے نے بہت تنگ کیا تو وہ ڈاکٹر صاحب سے کہنے لگا "قبلہ آج آسمان پر بادل ہیں"۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "جی ہاں! آج آسمان پر بادل ہیں" پھر خاموش رہ کر دوسرے حضرت بولے "جناب! آج ہوا میں خنکی ہے" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "جی ہاں! آج ہوا میں خنکی ہے" اس کے بعد دونو اصحاب وہاں سے تشریف لے آئے اور میرے دوست سے پیچ پا ہو کر کہنے لگے "کہ ایسے شاعر تو ہمارے ہاں بیسیوں کی تعداد میں ہیں۔ ہم نے خنکی اور بادلوں کا عمداً ذکر کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب طبع آزمائی کرکے ہمیں تازہ ترین اشعار سے محظوظ کریں گے۔ مگر وہ تو بالکل چُپ سادھے رہے" ڈاکٹر صاحب سے پہلی ملاقات کرنے سے پیشتر جس غلط فہمی میں مَیں مبتلا تھا یہ لوگ بھی یقیناً اُسی غلط فہمی میں گرفتار تھے۔

الحمدللہ کہ جب میں ان سے دوسری ملاقات کرنے کے لئے حاضر ہوا تو اس غلط فہمی کو رفع ہوئے گویا صدیاں ہو چکی تھیں۔ وہ توقعات جنہیں دل میں لے کر مَیں اُن سے پہلی مرتبہ ملنے گیا آج کبھی اُن کا دل میں خیال بھی آجائے تو عرقِ خجالت میں ڈوب جاتا ہوں۔

کچھ عرصہ کے بعد شوقِ دید پھر مجھے اُن کے درِ دولت تک لے پہنچا۔ اس وقت آپ ایک شخص سے محوِ گفتگو تھے۔ مَیں بھی قریب جا کر بیٹھ گیا۔ غالباً مکان و زمان کے مسئلہ پر بحث شروع تھی۔ مَیں دلائل کی ابجد تک سمجھنے سے قاصر تھا۔ البتہ دفعتاً فوقتاً آئن سٹائن۔ طوسی۔ شہرستانی وغیرہم ایسے نام سُننے میں آرہے تھے اور ان کی بحث میں صرف یہ جملہ آج تک یاد ہے کہ صوفیائے کرام کے نزدیک مکان و زمان ایک سے زیادہ ہیں۔ میری طرف مُڑ کر فرمانے لگے "کہیئے" مَیں نے عرض کی "صرف زیارت کے لئے حاضر ہوا ہوں" سُن کر خاموش ہو گئے اور میں چُپکا بیٹھا اُن کی گفتگو سُنتا رہا۔ شام کا وقت تھا جب اندھیرا زیادہ ہونے لگا تو اجازت مانگ کر واپس چلا آیا۔ کئی ماہ کے بعد اُن کی کوٹھی کے سامنے سے پھر گزر ہوا تو دل میں آئی کہ ڈاکٹر صاحب سے ملتے ہی چلیں۔ اجازت لے کر ان کے کمرے میں پہنچا اور سلام عرض کر کے ان کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت یونیورسٹی امتحانات کے پرچے دیکھنے میں مصروف تھے۔ کہنے لگے "کس طرح آئے؟" مَیں نے کہا "ایک پریشانی ہے جسے رفع کرنا چاہتا ہوں" "یعنی؟" مَیں نے عرض کی "نکلسن نے عربوں کی ادبی تاریخ میں قرآن شریف کی دو آیتوں کا انگریزی ترجمہ کر کے ثابت کیا ہے کہ ان کے معانی میں کامل تضاد ہے ایک آیت کا مطلب ہے کہ انسان جو چاہے کرے اور دوسری کا یہ کہ سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ آیات مجھے یاد نہیں مگر ان کے معانی قریب قریب یہی ہیں" فرمانے لگے "جب نکلسن نے کتاب شائع کی تھی تو مَیں نے اُس کا مطالعہ کرنے کے بعد اُسے لکھا تھا کہ یہ "تضاد" کی بکواس کیسی۔ جسے تم تضاد

کہہ رہے ہو وہ حقائقِ زندگی کے عین مطابق ہے"۔ میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب! میں نہیں سمجھا کہ حقائقِ زندگی کے مطابق ہونے سے آپ کی کیا مراد ہے" کہنے لگے "کیا ہر انسان خود کو بعض لمحات میں مختار کامل اور بعض میں بالکل مجبور محسوس نہیں کرتا؟" میں نے کہا "جی ہاں" کہنے لگے "تو بس میرا یہی مطلب ہے۔ حقیقت کوئی یکرنگ چیز نہیں بلکہ ایک مختلف الالوان مرکب ہے" میں نے پوچھا "قبلہ اس میں کیا مصلحت ہے کہ انسان مختار بھی ہے اور مجبور بھی۔ کیوں نہ ہمیں بالکل مجبور یا مختار بنایا گیا؟" مسکرا کر فرمانے لگے "اس کی مصلحت سے تو وہی واقف ہے جس نے انسان کو پیدا کیا۔ البتہ انسانی عظمت کی دلیل یہ ہے کہ آدمی اپنی مجبوریوں پر غالب آ رہا ہے۔ احوالِ زندگی کے مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی تقدیر تک پہنچ رہا ہے" پھر میں نے پوچھا "کیا قوتِ وجدان ہر شخص میں موجود ہے؟" کہنے لگے "ہاں۔ عورتوں میں مردوں سے نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے۔ صوفیا نے اس قوت کی نشو و نما کے طریقے بھی بتائے ہیں۔ بعض لوگ اُن پر عمل کرنے سے کامیاب ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ نہیں ہوتے" اس کے بعد میں نے ان سے قرآنی تفاسیر کے متعلق سوال کیا "کہ آپ کے خیال میں کونسی تفسیر بہترین ہے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اکثر مفسرین قرآن کے مختلف الفاظ کے معانی اور ان کی صرفی و نحوی خوبیوں کے دکھانے میں اپنی تمام تر کوشش صرف کر دیتے ہیں" کہنے لگے "ہاں۔ مگر ایسی کتابوں کی بھی ضرورت ہے" تفسیر کے متعلق میں نے ایک دو اور مواقع پر بھی ان سے سوال کیا۔ مگر نہ معلوم کیوں وہ اس سوال کے جواب میں ہمیشہ خاموش رہے۔

ایک عرصہ کے بعد ان سے پھر ملنے کا اتفاق ہوا۔ میرے علاوہ ایک پروفیسر صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ سلسلۂ کلام شروع تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو پروفیسر صاحب سے کہہ رہے تھے کہ "ہمارے نوجوان اگر آج بھی اپنے اخلاق درست کر لیں تو میں امید کرتا ہوں کہ ان کا مستقبل خوشگوار ہو گا۔" دورانِ گفتگو

میں پروفیسر صاحب نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ آج تک کوئی قوم یا کسی قوم کی تہذیب مرنے کے بعد پھر زندہ نہیں ہوئی" کہنے لگے "یہ خیال صحیح نہیں۔ مختار قومیں عام طور پر اپنے محکوموں کے دل و دماغ پر یہ خیال اسلئے مسلّط کر دیتی ہیں کہ اُن میں پھر سے اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہی نہ ہو سکے۔ اسلام اس خیال کا قطعی مخالف ہے۔ آپ محض ایک قوم کے متعلق فرماتے ہیں کہ مرکر زندہ نہیں ہو سکتی۔ مگر خیال فرمائیے قرآن تو قیامت کا قائل ہے وہ تو کہتا ہے کہ ایک قوم کیا ساری دُنیا مر کے ایک بار پھر زندہ ہوگی"۔ لفظِ قیامت کی اس تفسیر سے جو سرور مجھے حاصل ہوا اس کا اندازہ مَیں خود نہیں کر سکتا۔ پروفیسر صاحب کے چہرے کو دیکھا تو وہاں بھی مسرت کی سُرخی نظر آئی۔ یہ ملاقات جب بھی یاد آئے۔ قیامت کی تفسیر یاد آجاتی ہے۔

اس کے بعد دو ملاقاتیں اور ہوئیں جن کا نقشہ ہو بہو آنکھوں کے سامنے ہے اور جنکے تاثرات عمر بھر تازہ رہیں گے۔ پہلی ملاقات دو ہم جماعت عزیزوں کے علاوہ پروفیسر صوفی غلام مصطفٰے صاحب تبسّم کی معیّت میں نصیب ہوئی۔ آپ اپنی پُرانی کوٹھی کے برآمدہ میں ایک قمیص اور شلوار پہنے ہوئے رونق افروز تھے حُقّہ پاس رکھا تھا۔ وہ مرض جس سے اُن کی آواز قریباً بالکل بیٹھ چکی تھی اور جس نے اُن کو غالباً دمِ واپسیں تک نہ چھوڑا اُسے لاحق ہوئے ان دنوں تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ پہلے صُوفی صاحب سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اُس کے بعد فرمانے لگے۔ کہ "آج ایک رُوسی ترک موسٰی جاراللہ مجھے ملنے کیلئے آرہے ہیں غالباً پندرہ بیس منٹ تک آجائیں گے۔ وہ رُوس سے یہاں تک محض اس لئے آئے ہیں کہ مجھ سے اسلامی نظریۂ سیاست و نظامِ حکومت کے متعلق استفسار کریں۔ کتنا افسوس ہے کہ رُوس سے یہاں تک انہیں ایک شخص بھی ایسا نہیں مل سکا جو اُن کی اِن امور میں تشفی کر سکتا" قریباً دس منٹ گزرے ہوں گے۔ کہ

موسیٰ جار اللہ صاحب تشریف لے آئے۔ پردے کے متعلق ضمنی طور پر ایک مختصر سی بحث چھڑ گئی۔ ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے "فطرت کا تقاضا معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز جس میں تخلیقی صفات ہوں پردے میں رہے۔ خود خدا کو دیکھئے بے حجاب نہیں۔ زندگی کو لیجئے اگرچہ اس کے آثار کو ہم دیکھ سکتے ہیں مگر بذاتِ خود وہ ہماری نگاہوں سے پنہاں ہے۔ اسی طرح آپ جس چیز کو بھی لیں جو کارِ تخلیق سے تعلق رکھتی ہو آپ دیکھیں گے کہ وہ نقاب پوش ہے۔ اس پر موسیٰ جار اللہ نے کہا کہ ہم لوگ بھی پردے کے قائل تو ضرور ہیں مگر حجاب رُو ضروری نہیں سمجھتے اور نہ ہی قرآنِ کریم میں اس کے متعلق کوئی نصّ قطعی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "نہیں قرآن حجابِ رو کا قائل ہے" یہاں پہنچ کر میرا جی چاہتا تھا کہ قطع کلام کر کے ڈاکٹر صاحب سے اس نکتے کی مزید وضاحت کے لئے درخواست کروں مگر اتنی بے باکی کی جرأت پیدا نہ ہو سکی لہٰذا طوعاً و کرہاً خاموش ہو رہا۔ اس کے بعد سلسلۂ کلام نے اصل موضوع کی طرف رجوع کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسلامی نظام سیاسی پر اظہار خیالات کی ابتدا کرتے ہوئے کہا کہ "انسان ایک فردِ یکتا یا گوہرِ یکتا ہے جس کی ترکیب رُوح اور مادے سے ہوئی ہے لہٰذا ہر وہ نظام حکومت جو محض انسان کی جسمی یا مادی ضروریات کو پورا کر سکے انسان کی تشفی نہیں کر سکتا اور نہ ہی نوعِ انسانی اس نظام کے وضع کردہ راستے پر گامزن ہو کر ارتقائی سیادت سے بہرہ ور ہو سکتی ہے اسلام دین و سیاست میں تفریق اسی لئے روا نہیں رکھتا کہ انسان کی ہیئتِ ترکیبی ان ہر دو عناصر کے امتزاج کی متقاضی ہے۔ اسلامی نظام حکومت نہ جمہوریت ہے نہ ملوکیت نہ Aristocracy ہے اور نہ تھیاکریسی Theocracy بلکہ ایک ایسا مرکب ہے جو ان تمام کے محاسن سے متصف اور قبائح سے منزہ ہے" اس فقرے کی کچھ تشریح کرنے کے بعد موضوع سے متعلقہ افکار و خیالات کا اظہار جہاں جہاں ان کی کتابوں میں ہو چکا تھا۔ آپ نے ان مقامات کی طرف موسیٰ جار اللہ کی توجہ مبذول کرائی۔

سلسلۂ کلام اگرچہ فارسی میں تھا تاہم زبان اتنی سلیس تھی کہ باوجود فارسی سے بخوبی واقف نہ ہونے کے ان کی ایک ایک بات سمجھ رہا تھا۔ بعد ازاں کچھ دیر تک موسیٰ جار اللہ آپ سے آپکے کئی ایک اشعار کے معانی اور گرامر کی رو سے ان کی تراکیب کے متعلق پوچھتے رہے۔ شام ہو چکی تھی اور چونکہ موسم سرما تھا لہذا ہوا میں خنکی ذرا ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر صاحب کا ملازم ایک کمبل لے آیا۔ جو متبسم صاحب نے آپکے کندھوں کے گرد ڈال دیا۔ سلسلۂ کلام بڑھانا چاہتے تھے کہ آپ کی آواز نے قریباً بالکل جواب دیدیا۔ اور آپ موسیٰ جار اللہ کو یہ کہہ کر رخصت کرنے پر مجبور ہو گئے "کہ کل پھر تشریف لایئے" اس کے بعد مجلس برخاست ہو گئی اور ہم واپس آ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دل و دماغ ایک جہان نور و سرور میں منتقل ہو چکے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک احساسِ حسرت بھی لاحق تھا جیسے لیلائے محمل ایک ہی جھلک دکھا کر غائب ہو گئی ہو یا زندگی بھر کی خوش گشتہ آرزوئیں ایک سہانے خواب میں پوری ہو رہی ہوں اور آنکھ کھل جائے۔

ایم۔ اے کے آخری سال میں ہم چند ہم جماعتوں نے موسم سرما کی ایک شام کو دفعتہً ارادہ کیا۔ کہ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لیئے چلیں۔ ارادہ کرتے ہی ہوسٹل سے روانہ ہو پڑے اور راستے میں صلاح کی کہ آج حضرت علامہ سے مسئلہ خیر و شر کے متعلق استفسار کریں گے۔ در دولت پر پہنچکر اجازت لینے کے بعد ایک کمرے میں بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب اسوقت ساتھ کے کمرے میں مصروف مطالعہ تھے۔ خبر پا کر تشریف لائے۔ مزاج پرسی کے بعد ہم میں سے ایک نے اس مسئلہ کو چھیڑنے کی جرأت کی تو فرمانے لگے کہ "آپنے فلسفہ کے پروفیسر سے کیوں نہیں پوچھتے وہ کوئی کتاب بتا سکیں گے"۔ اس پر ایک اور صاحب نے ان کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ "ہم قرآنی اور اسلامی نظریۂ خیر و شر کے متعلق پوچھنا چاہتے ہیں" فرمایا۔ "پہلے اس مسئلہ کی عام بحث سے واقفیت حاصل کر لو۔ اس کے بعد میرے پاس آنا اور جو جی چاہے پوچھ لینا

ڈکنسن نے ایک کتاب لفظِ خیر سے مُراد The meaning of good لکھی ہے
وہ مفید مطلب رہے گی۔ کتاب آسان ہے۔ اگر کسی نے فلسفہ نہ بھی پڑھا ہو تو وہ بھی بلا دقت اُسے سمجھ
سکتا ہے" اس کے بعد ایک صاحب نے پوچھا" ڈاکٹر صاحب۔ اسلام کس نظام حکومت کا قائل ہے؟"
فرمایا کچھ عرصہ ہوا میں نے اس موضوع پر موسیٰ جاراللہ سے بحث کی تھی۔ اُس بحث کو دُہرا نہیں سکتا۔ البتہ
اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت نہ جمہوریت ہے نہ ملوکیت نہ ارشاکریسی Aristocracy
ہے نہ تھیاکریسی Theocracy ہم نے کہا" تو پھر وہ کونسا نظام ہے اگر ان چاروں میں سے ایک
بھی نہیں ؟" مسکرا کر فرمانے لگے" اس نظام کو معرضِ وجود میں لانا آپ لوگوں کا کام ہے" پھر آپ نے
ہم سے تھیاکریسی کی تعریف پُوچھی مگر باوجود اس کے کہ بعض ہم جماعت پولٹیکل سائنس کے طالبعلم
تھے ہم میں سے کوئی بھی صحیح جواب نہ دے سکا۔ اس پر ہمیں کچھ ندامت سی محسوس ہُوئی۔ آپ
مسکرانے لگے اور ایک کتاب طاق میں سے نکال کر ہمیں اس لفظ کی تعریف پڑھ کر بتائی۔ پھر ہم نے
آپ سے جنّت کے متعلق سوال کیا فرمایا" قرآن نے کئی قسم کی جنّتیں بیان کی ہیں۔ بعض مادّی ہیں
اور بعض روحانی۔ مادّی جنّتوں کے بیان سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ مگر بعض بعض مقامات پہ
روحانی جنّتوں کا بھی ذکر ہے"۔ مَیں نے عرض کیا کہ قرآن نے رُوحانی جنّت کی تعریف کس طرح کی ہے؟
فرمایا" فِیْهَا لَا لَغْوٌ وَّ لَا تَاْثِیْمٌ" اس کے بعد ہم میں سے ایک نے کہا" قبلہ یہ بڑے
بڑے لوگ جو ہیں سر فلاں اور خان بہادر فلاں میں سمجھتا ہُوں کہ یہی ہماری ترقّی کے راستے میں حائل
ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو ہمیں نسبتاً کم مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ فرمایا" زندگی اس طرح بسر کرو۔ گویا
یہ لوگ پیدا ہی نہیں ہُوئے۔ مجھے دیکھو' مَیں کسی کی پروا نہیں کرتا۔ یہی لوگ میرے پاس بھی کبھی کبھی

آجاتے ہیں۔ علیک سلیک کر کے چلے جاتے ہیں۔ میں بھی جواباً علیک سلیک کہہ دیتا ہوں۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔ انہیں محض بڑی بڑی تنخواہوں کا وصول کرنا ہی آتا ہے۔ اسکے علاوہ یہ کچھ نہیں جانتے" پھر نماز کا ذکر آگیا، کسی نے پوچھا کہ" اگر اُردو میں نماز پڑھ لی جائے تو کیا حرج ہے" کہنے لگے" عربی میں نماز بالکل سیدھی سادی ہے کوئی مشکل الفاظ نہیں لہذا نماز کے اُردو ترجمے کا خیال نہیں پیدا ہونا چاہیئے۔ ویسے اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ اُردو میں بھی کوئی حرج نہیں۔ مجھے یاد ہے میری والدہ صاحبہ عربی الفاظ کا تلفّظ صحیح نہ کر سکتی تھیں لہذا میرے والد صاحب اُنہیں اجازت دیا کرتے تھے کہ وہ بیشک اُردو میں ہی نماز پڑھ لیا کریں" (خدا کی قدرتیں بہت ذیشان ہیں۔ ماں وہ کہ نماز کے سادہ عربی الفاظ کا صحیح تلفّظ نہ کر سکے، اور بیٹا وہ جس کی علمیت کا ایک جہان معترف ہو اور جس کی قابلیّت کے سامنے ایک دُنیا سرِ تسلیم خم کرے)

اُن دِنوں بالِ جبریل نئی نئی شائع ہوئی تھی اور ان کی "سمجھا تھا میں" والی غزل زبان زدِ خاص و عام تھی۔ ویسے اس غزل کا پہلے ہی سے شہرہ تھا کیونکہ بالِ جبریل کی اشاعت سے پیشتر وہ رسالہ "کارواں" کے پہلے نمبر میں شائع ہو چکی تھی۔ ہم میں سے کسی نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب اس غزل کا بہترین شعر یعنی

عرصۂ محشر میں میری خوب رُسوائی ہوئی
داورِ محشر کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں

شائع ہونے سے رہ گیا۔ کہنے لگے" ہاں۔ مگر مجھے اس بات کا اس وقت خیال آیا جبکہ کتاب کاتب کے پاس جا چکی تھی اور اس شعر کا اندراج ممکن نہ تھا۔" ازاں بعد اور آپ کے

نظریۂ فوق البشر کے متعلق بات چیت ہوئی تو ہم نے آپ سے دریافت کیا کہ فوق البشر کی کیا تعریف ہے۔ کہنے لگے "ہر صحیح مومن فوق البشر ہے اور اسلام وہ بہترین سانچہ ہے جس میں فوق البشر ڈھلتے ہیں" چونکہ کارلائل کی کتابیں ہمارے کورس میں شامل تھیں لہذا ضمنی طور پر اُس کے نظریۂ ہیرو (Hero) کے متعلق بھی تذکرہ آگیا۔ کہنے لگے ہیرو کی تعریف یہ ہے کہ "وہ انسان جس کے اعمال و افعال نوعِ انسانی کے لئے چشمہ ہائے زندگی جاری کرنے والے ہوں" شخصیت پرستی Heroworship ہندو قوم کی امتیازی صفت ہے مگر اسلام اس کے خلاف ہے۔ یہاں آپ نے بہ طریقِ تعلی نہیں بلکہ گزارشِ احوالِ واقعی کے طور پر ایک تقریب کا قصہ سُنایا۔ جس پر وائسرائے کے علاوہ ہندوستان کی ریاستوں کے فرمانروا اور دیگر اکابر و زعمائے ملک کا ایک جمِ غفیر رونق افروز تھا۔ کہنے لگے "جس وقت مہاتما گاندھی اس مجمع میں داخل ہوا تو قریباً سب لوگ اُس کی تعظیم کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جس کے سامنے سے گزرتا وہی احتراماً اُٹھ کھڑا ہوتا مگر جب میرے پاس سے گزرا تو مَیں بدستور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ اس کے بعد وائسرائے نے چند لوگوں کی دعوت کی جن میں میں بھی مدعو تھا۔ دعوت کے بعد وائسرائے نے مجھے تنہائی میں کہا " کہ مَیں آپ سے ایک سوال پُوچھنا چاہتا ہوں بشرطیکہ آپ کسی سے اُس کا ذکر نہ کریں"۔ مَیں نے کہا کہیے۔ کہنے لگا: "کہ تقریب پر مہاتما گاندھی کی تعظیم کے لئے سب لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ مَیں نے سر شفیع کو بھی اُٹھتے ہوئے دیکھا مگر آپ اپنی جگہ پر بدستور قائم رہے۔ اس کا کیا سبب ہے؟ فرمایا ایک دو سیکنڈ تو میں خاموش رہا۔ مگر پھر مجھے دفعتہً جواب سُوجھا اور مَیں نے کہا غالباً آپ کو معلوم نہیں کہ اس ملک میں کئی مسلمان ایسے ہیں۔ جن کے باپ دادا ہندو تھے۔ اُن میں سے اکثر و بیشتر ہنوز اپنے آباء و اجداد کی صفات سے متصف ہیں۔ الحمد اللہ مَیں اُن میں سے نہیں ہُوں"۔

پھر آپ نے کہا کہ اسوۂ رسول شخصیت پرستی کی مخالفت کا بہترین مظہر ہے۔ رسولِ خدا صحابہ کرام کی جماعت کے پاس جب کبھی جاتے تو وہ آپ کو دُور سے دیکھ کر تعظیم کے لئے کھڑے ہو جایا کرتے آپ نے ایک دو مرتبہ دیکھا اور تیسری مرتبہ منع فرمایا۔ خیال کیجئے، وہ ہستی جس کی خاطر اُس کے متبعین اپنے خون کا آخری قطرہ گرا دینا دینی و دنیوی سعادتمندی کا واحد ذریعہ تصوّر کرتے تھے اُسے اتنا بھی گوارا نہ تھا کہ کوئی اُس کی خاطر اُٹھ کھڑا ہو۔ ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا شام کا کھانا کھانے کے بعد صحابہ کرام کے ہمراہ عام طور پر صحرا میں برائے سیر جایا کرتے تھے۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ جب آپ مصروفِ سیر تھے تو چند غزال آپ کے پاؤں کو آکر چومنے لگے۔ صحابہ نے عرض کیا "قبلہء دو عالم! جانوروں کو تو یہ سعادت نصیب ہو مگر ہم اس کے لئے ہمیشہ ترستے رہیں" آپ نے فرمایا۔۔ یہاں ڈاکٹر صاحب بالکل خاموش ہو گئے جیسے طاقتِ گفتار یک لخت جواب دے گئی ہو۔ چونکہ ہم نے سُن رکھا تھا کہ ذکرِ رسولؐ سے آپ کی کیا کیفیت ہوا کرتی ہے لہذا ہم ہمہ تن دیدبن کر اُن کیطرف دیکھ رہے تھے اور وہ مثالِ مجسمہ جامد و ساکت تھے۔ کمرے میں سناٹے کا عالم تھا۔ خاموشی نے طول پکڑا یہاں تک کہ تقریباً ایک منٹ اسی طرح گزر گیا۔ اس کے بعد اُن کے چہرہ پر ایک لرزش نمودار ہوئی اور اس کے ساتھ ہی رُخساروں پر آنسوؤں کی بارش شروع ہو گئی۔ سسکتے ہوئے کہنے لگے "رسولِ خدا نے فرمایا۔ "اُعْبُدُوا اللہَ اَکْرِمُوا اَخَاکُمْ" (یعنی بزرگوں کی محض واجبی تعظیم کرو۔ سجدے کے لائق صرف خدائے تعالیٰ کی ذات واحد ہے) بخدا دُنیا بھر کی ادبیات میں اس سے بہتر فقرہ مجھے دیکھنا نصیب نہیں ہوا" ہم اس واقعے سے اور ڈاکٹر صاحب کی کیفیت کے مشاہدے سے بے حد متاثر ہوئے۔ اس کے بعد سلسلۂ کلام کو جاری رکھنا بے محل سا معلوم ہوا۔ ویسے بھی کافی دیر ہو چکی تھی لہذا مجلس برخاست

ہوئی اور ہم اُٹھ کر چلے آئے۔ آجتک یاد ہے کہ اُس رات دلوں کی مَیل دُھل چکی تھی اور ہم سب اِس احساس سے مسرور تھے کہ بہر حال جیتے جی کم از کم ایک مسلمان تو دیکھ لیا۔

اسلام کی موجودہ حالت کے پیشِ نظر یہ واقعہ خرقِ عادت کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب بھی یاد آجائے حیرت ہوتی ہے کہ اس کافرستان میں یہ دیوانۂ رسُول کس طرح پیدا ہو گیا اور اس ظلمت کدۂ الحاد میں یہ قندیلِ ایمان کیسے جگمگا اُٹھی۔ تعجب ہوتا ہے کہ باوجود اتنی سیہ کاریوں کے مسلمان اس نعمت سے مشرف ہونے کے لئے دیدۂ قدرت میں کیونکر منتخب ہو گئے اور یقین نہیں آتا کہ

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

آج اس واقعہ کو قریباً چار سال ہو چکے ہیں۔ مگر تاثرات کی تازگی کے سبب ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کل کی بات ہے۔ علّامہ مرحوم کی تصویر بار بار آنکھوں کے سامنے آ کر جنّت نگاہ بن رہی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ وہ پیکرِ حیات جس کے کلام کا ہر لفظ عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا دینے کی صلاحیّت رکھتا ہے خود موت کے چنگل سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ جہاں تک "دنیائے سماوی" کا تعلّق ہے پہلی ملاقات کا منظر آج کی رات سے مشابہہ تھا۔ گرد و پیش کا سماں اُن لمحاتِ رفتہ کی خوابیدہ یاد کو پیامِ برخیز دے رہا ہے۔ آسمان پہ "تارے آوارہ و کم آمیز" نظر آتے ہیں۔ چاندنی دُور دُور تک چھٹکی ہوئی ہے۔ جہان بقعۂ نور بن رہا ہے گویا زمین ایک شفاف نوری سمندر کی تہ میں مستقر ہو گئی ہو۔ اُفق کے قریبی مناظر تاریکی کے ہلکے حجاب میں کھوئے کھوئے معلوم ہوتے ہیں۔ دل میں ارمانوں کی لہر اُداس نغموں کے زیر و بم کی طرح کبھی اُٹھتی ہے کبھی بیٹھ جاتی ہے۔ بے ثباتِ انسانی زندگی کا منظر طلسمی نقش و نگار کی صورت ہر لمحہ "فریبِ نظر" بن رہا ہے۔ ابھی پیدا، ابھی

پنہاں، افکار پریشاں مجسمۂ حیرت بن کر اس موج سراب کے معمۂ ہست و نیست سے دوچار ہیں۔ انسانی زندگی کے پیہم ظہور و پیہم غیوب کا تصوّر دل و دماغ پر حاوی ہے اور اس تصوّر کی آغوشِ بسیط میں دوشِ امروز امروز و فردا آپس میں مِل مِل کر جُدا ہو رہے ہیں۔ تقسیمِ زمانہ کی مصنوعی حدود احساسی طور پر پھیکی پڑ چکی ہیں گویا ماضی و حال و مستقبل ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہوں۔ ایّام رفتہ کی تصویر عرصۂ تخیّل میں پیدا ہو ہو کر چشمِ تصوّر سے اوجھل ہو رہی ہے۔ کمرے کے اندر چاند کی کرنیں ایک میز پر پڑ رہی ہیں جس کے ایک کونے پر ڈکنسن کی کتاب **The meaning of good** میری زندگی کے رفتہ و حاضر کو عین و لیسار میں لئے ہوئے ایک عرصہ سے پڑی ہے۔ کتاب کا مطالعہ کئے مدّت ہو چکی ہے۔ مسئلہ خیر و شر کے متعلق ابتدائی خیالات جو کبھی حصارِ سنگیں معلوم ہوتے تھے، مصنّف کی تخریبی تنقید سے شکوک و شبہات کی اُس فضا میں تحلیل ہو چکے ہیں جہاں پائے تخیّل کو قرار نہیں۔ نگاہیں آفاق کی تاریکیوں اور فضا کی نوری پہنائیوں میں حیران و سرگرداں اُس ہستی کی متلاشی ہیں جس کا وعدہ تھا کہ تم خیر و شر کی عام بحث سے واقفیت حاصل کر کے میرے پاس آؤ، میں تمہیں اسلامی نظریۂ خیر و شر سے آگاہ کر دوں گا۔ اُس کے جیتے جی تو ہزاروں اُمیدیں تھیں مگر آج جبکہ ہر لمحہ اس دلخراش حقیقت کا سامنا ہے کہ

"ہُوا جو خاک سے پیدا وہ خاک میں مستور"

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ دل و دماغ کی پریشانیوں کو رفع کرنے کی تدبیر کیا ہو گی ع

ہر اک سے پُوچھتا ہُوں کہ جاؤں کدھر کو مَیں

اگر ایفائے وعدہ نہ ہُوا تو قصور کس کا؟ اسے اپنی شوخیٔ قسمت تصوّر کروں یا مشیّتِ ایزدی؟

اسے اپنی مجبوری کہوں یا ان کی؟ یہ تعبیرات سُود مند ہوں یا بے سُود، با معنی ہوں یا بے معنی، حقیقت

ہوں یا دھوکا مگر دِل کو یہ احساس ہر لمحہ کھائے جارہا ہے کہ یہ وعدہ اب قیامت تک کے لئے ایفا طلب رہ گیا اور یہ اُمید عمر بھر کیلئے حسرتِ جانگداز میں منتقل ہو گئی ؂

قصاصِ خونِ تمنّا کا مانگئے کِس سے
گُناہگار ہے کون اور خونبہا کیا ہے؟

دو ملاقاتیں

سیّد عابد علی عابد ایم۔اے، ایل ایل بی

ٹھیک یاد نہیں لیکن غالباً ۱۹۲۳ئہ یا ۱۹۲۴ئہ کی بات ہے۔ کہ ایک بیرونی یونیورسٹی میں اردو کی پروفیسری خالی ہوئی۔ مَیں نے بھی درخواست دی۔ لیکن درخواست دینے کے بعد چپکا بیٹھ رہا۔ ایک دوست نے جن کی تجربہ کاری پر بہت اعتماد تھا یہ قصہ سُنا تو انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ علامہ اقبالؔ سے سفارش کروائی جائے۔ اس وقت تک مجھے ان کی خدمت میں کبھی جانے کا اتفاق نہ ہُوا تھا۔ اور اُن کی عظمت کا نقشِ دل پر اس قدر گہرا تھا کہ یُوں کہیئے کہ جانے کی ہمّت ہی نہ ہُوئی تھی۔ لیکن یہ سفارش والا سلسلہ ایسا نکلا کہ مَیں نے اُن کی ملاقات کے وسائل کے متعلق تگ و دو شروع کی۔ جو ئندہ یابندہ ایک بزرگوار جن سے ابھی تک عقیدت

استوار ہے۔ اس معاملے میں خضرِ راہ ثابت ہوئے (خضرِ راہ علامہ اقبال کے کلام کی رعایت سے نہیں لکھا گیا۔) گرمیوں کے دن تھے شام کا وقت تھا۔ جب میرے یہ خضرِ طریقت مجھے اپنے ساتھ لے کر نکلے۔ تو میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ کبھی یہ خیال آتا تھا کہ علامہ میری سفارش کیوں کریں گے۔ نہ وہ مجھ سے ذاتی طور پر واقف نہ میرے ہفواتِ نظم و نثر کے آشنا۔ کبھی یہ خیال آتا تھا۔ کہ شاید میرے خضرِ طریقت کی سفارش مؤثر ثابت ہو اور علامہ میری سفارش پہ آمادہ ہو جائیں۔ بہر نوع راستہ کٹ گیا اور ہم علامہ اقبال کے میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کے دروازے پہ جا پہنچے۔ علامہ کا معمول یہ تھا کہ ہر قسم کے رسمی تکلفات سے بے نیاز ہو کر ملتے تھے۔ نہ کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہ سر دیر بارِ منتِ درباں کرنے کی حاجت۔ علامہ بیٹھے ہیں یا لیٹے ہیں۔ لوگ باگ آ جا رہے ہیں تانتا لگا ہوا ہے۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ خسرو کے اس شعر کا مطلب انہی کے مکان پہ جا کر سمجھ میں آتا تھا ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو

گیر و دار و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

یہ باتیں میں نے سن رکھی تھیں لیکن اس دن بچشم خود مشاہدہ کیں۔ علامہ برآمدے میں آرام کرسی پہ لیٹے حقہ پی رہے تھے۔ میں اور میرے دوست سلام کر کے بیٹھ گئے۔ ذرا اندازہ کیجئے۔ کہ اس وقت میرے دل میں کیا کیفیت ہو گی۔ دور سے تو علامہ کو کئی بار دیکھا تھا۔ اس دن پہلی بار یہ سعادت حاصل ہوئی۔ کہ ان کی باتیں سنیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ سچ مچ مجھ کو یقین نہیں آتا تھا کہ اقبال میرے سامنے لیٹا باتیں کر رہا ہے۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا کہ علامہ نے میرے خضرِ طریقت سے پوچھا کہ آپ کے ساتھ یہ کون ہیں؟ انہوں نے میرا نام بتایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ پنجاب کے بہت بڑے ادیب اور شاعر ہیں۔ انہوں نے ایک جگہ درخواست

دی جانی چاہیئے۔ آپ ان کی سفارش کریں۔ علامہ نے حقہ کا ایک کش لیا۔ "ہوں" کہا۔ اور میرے دوست سے سیاسی معاملات پر گفتگو کرنے لگے۔ ان سے باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک بیرسٹر صاحب تشریف لے آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ یہ صاحب علامہ سے ایسی بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے کہ مجھے تعجب ہوتا تھا۔ یہ بزرگوار بہت ہنس مکھ تھے اور پھبتی کہنے میں طاق۔ اُن کے آنے سے گفتگو کا رُخ تبدیل ہو گیا۔ اور علامہ بھی ان نووارد بیرسٹر صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔ مسکراتے جاتے تھے۔ اور کبھی کبھی اُن کی پھبتیوں کا جواب بھی دیتے تھے۔ یہ نووارد بیرسٹر صاحب اپنے ہم پیشہ قانون دانوں پر پھبتیاں کس رہے تھے اور حق بات یہ ہے کہ مزے کی باتیں کر رہے تھے۔ ناگاہ باتیں کرتے کرتے رُک گئے اور ایک عجیب انداز میں بے تکلفانہ کہا۔ "یار توں حقے دو رکھیا کر، اِک اپنے لئی تے اِک دُوسریاں لئی حقے دی نڑی مُنہ وِچ پا کے توں تے فیر کڈھدا ای نہیں۔ اسے تینوں خبرے کی بھیڑی عادت پے گئی ہوئی اے (یار تم حقے دو رکھا کرو۔ ایک اپنے لئے ایک دوسروں کے لئے۔ حقہ کی نے مُنہ میں لیتے ہو تو لئے ہی رہتے ہو۔ خُدا جانے تمہیں یہ کیا بُری عادت پڑ گئی ہے) مندرجہ بالا فقرے ٹھیٹھ پنجابی میں کچھ ایسے بے تکلفانہ انداز میں کہے گئے تھے کہ ہمیں بے اختیار ہنسی آ گئی۔ علامہ مسکرائے اور نوکر کو آواز دے کر کہا بیر صاحب کے لیئے دوسرا حقہ لے آؤ۔ مَیں علامہ کی باتیں دلچسپی سے سُن تو رہا تھا۔ لیکن میرے گوشِ قلب میں ایک شُبہ سا پرورش پا رہا تھا کہ علامہ میری سفارش نہ کریں گے کیونکہ انہوں نے اس معاملے میں سوائے "ہوں" کہنے کے اس کے بعد کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد میرے خضرِ طریقت نے میرا زانو دبایا۔ گویا مجھے اشارہ کیا کہ اُٹھو چلیں۔ مَیں نے اجازت چاہی اور ساتھ ہی میرے خضرِ طریقت نے کہا عابد صاحب کے لئے سفارش۔ فرمایا "سفارش ہاں" پھر انگریزی میں کہا "جو آپ مناسب سمجھیں لکھ لائیں مَیں دستخط کر دوں گا۔" ہم دونوں سلام کر کے رُخصت ہوئے۔ علامہ

کے "محقق" دوست ابھی تشریف رکھتے تھے۔ راہ میں میرے خضرِ طریقت نے مجھ سے کہا لو بھئی تمہارا کام تو ہوگیا۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ گھر پہنچا تو سوچتا رہا کہ یہ بھی علامہ نے کیا ارشاد فرمایا جو مناسب سمجھو لکھ لاؤ کبھی یہ خیال آتا کہ پھر جب ان کی اجازت ہے تو کیوں نہ اپنے متعلق واقعی جو جی میں آئے لکھ لوں۔ پھر سوچتا بہت بیہودہ بات ہوگی کہ علامہ تو مجھ پہ اتنا اعتماد کریں اور میں یہ حرکت کروں نتیجہ یہ نکلا کہ جو کچھ میں نے اپنے متعلق لکھا نہایت معقول تھا شام کو وہ تحریر لے کر علامہ کی خدمت میں پہنچا۔ انہوں نے تحریر پڑھی مسکرائے اور مجھ سے کہا۔ کہ ان لفظوں سے آپ کا کام ہو جائے گا۔ میں نے عرض کی جی امید تو ہے۔ وہ پھر مسکرائے اور فرمایا۔ دیکھ لیجئے میں نے آپ کو کھلی چھٹی دے دی تو آپ نے خود ہی اپنی تعریف سے مبالغے سے کام نہیں لیا۔ یہ کہہ کر دستخط کر دیئے۔

اس کے بعد کئی بار علامہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ جن میں سے اس مرحلے پر میں صرف ایک ملاقات کا تفصیلی ذکر کروں گا۔

دسمبر ۱۹۳۷ء میں ایک دن میں اور میرے ایک دوست کسی کام سے جا رہے تھے کہ سنٹرل ٹریننگ کالج کے پاس ہمیں ایک خوش پوش نوجوان نے ٹھہرا لیا۔ ان دنوں یوم اقبال منانے کی تحریک کا بڑا چرچا تھا۔ میں اگرچہ ذرا فاصلے پر تھا لیکن میں سن رہا تھا کہ یہ نوجوان اس تحریک کے متعلق کچھ باتیں کر رہا ہے چنانچہ یہ سمجھ کر کہ ان دونوں کی باتیں شاید ایسی ہوں کہ میرا شامل ہونا انہیں ناگوار ہو۔ میں ذرا آگے بڑھ گیا۔ میرے دوست نے مجھے آواز دیکر بلایا۔ اور اب معلوم ہوا کہ یہ نوجوان میرے دوست سے یوم اقبال کے سلسلے میں مشورہ لے رہا ہے، میرے دوست نے میرا تعارف کرایا تو اس باہمت نوجوان نے میرا نام سنتے ہی فوراً کہا کہ آپ علامہ کی شاعری پر کوئی پیپر پڑھیں گے۔ میں نے کوئی رسمی سا عذر پیش کیا

لیکن دونوں صاحب میرے سر ہوگئے اور آخر مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ میں اقبال اور فنونِ لطیفہ پر مقالہ پڑھوں گا"

رات کو لوٹا اور اس مضمون کا خیال آیا تو کچھ اُلجھن سی ہونے لگی۔ سوچتا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ کہہ جاؤں جو علامہ مرحوم کی تعلیم کی اصل رُوح کے خلاف ہو۔ اگرچہ نقاد کی حیثیت سے مجھے کامل آزادی حاصل تھی۔ لیکن علامہ مرحوم سے جو مجھے عقیدت تھی۔ اس کی وجہ سے یہ خیال ضرور پیدا ہوتا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ کہہ جاؤں جس سے اصل مقصد (اقبال کے نظریۂ فنونِ لطیفہ کی تفسیر) فوت ہو جائے۔ یا علامہ کو کسی قسم کی ذہنی تکلیف ہو۔

دوسرے دن راجہ حسن اختر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ تو میں نے موقع پا کر اپنی الجھن کا ذکر چھیڑا۔ راجہ صاحب نے بے ساختہ کہا کہ چلئے علامہ کے ہاں چلتے ہیں ـ مجھے جرأت تو نہیں کہ ان کے سامنے بحث کا آغاز کر سکوں۔ لیکن اگر آپ کسی مسئلے پر بحث چھیڑ دیں گے اور علامہ کو اس سے دلچسپی پیدا ہو جائیگی تو کئی گرہیں خود بخود کھل جائیں گی۔ چنانچہ اسی شام میں اور راجہ صاحب علامہ کے در دولت پر حاضر ہوئے

ایک دو اور بزرگوار بھی بیٹھے تھے جن کو میں نہیں پہچانتا تھا۔ حسنِ اتفاق سے ایک مقامی شاعر کا ذکر آگیا۔ جس میں یو۔ پی کے ایک بر خود غلط شاعرِ انقلاب نے بہت ہنگامہ بپا کیا تھا۔ اسی سلسلے میں اردو اور فارسی محاورات اور تضمینات کا ذکر چھِڑ گیا۔ یاد نہیں کہ دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز کس نے کہا۔ میں نے یہ محاورہ سن کر غالب کا شعر پڑھا ؎

بادہ زے پیرِ آئینہ پرہیز گفتہ اند

اے دروغِ مصلحت آمیز گفتہ اند"

علامہ مسکرائے اور ایک شعر پڑھا۔ جو مَیں نے اچھی طرح نہیں سُنا۔ کیونکہ اُن کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ کچھ لفظ کان میں پڑتے تھے۔ کچھ نہیں سُنائی دیتے تھے، میرے چہرے کے انداز سے وہ بھانپ گئے کہ مَیں نے شعر نہیں سُنا۔ اسلئے پھر ذرا بلند تر آواز سے پڑھا ؎

راستی فتنہ انگیز، اس سہی قد کا ہے قد،
اور دہن اس کا دروغ مصلحت آمیز ہے

راجہ صاحب نے موقع دیکھ کر کہدیا کہ عابدؔ صاحب "اقبال اور فنونِ لطیفہ" پر ایک مقالہ پڑھ رہے ہیں۔ علامہ نے میری طرف تیز تیز تجسّسانہ نظروں سے دیکھا۔ جن لوگوں کو ان نظروں کی دُور بینی اور دُور رسی محسُوس کرنے کا اتفاق ہوُا ہے۔ وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان تیز تیز نظروں میں کیا بات پوشیدہ تھی۔ علّامہ کی آنکھیں گویا، مخاطب کے تمام سرمایۂ ذہنی کو ٹٹول کر، گویا اس کے تہہ قلب کے خفیہ ترین گوشوں میں پہنچ کر اس کے اعمال اور افعال کے محرکاتِ شعوری اور غیر شعوری کا جائزہ لیتی ہوُئی معلوم ہوتی تھیں۔ اور اس طرح محسوس ہوتا تھا گویا علامہ مخاطب کو تول رہے ہیں۔ ان تاثرات کو بیان کرنے کے لئے پانچ چھ سطریں لکھنے کی ضرورت پڑی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہو گیا۔ ایک آدھ منٹ چپ رہنے کے بعد علامہ نے فرمایا "میرے کلام کو آرٹ (شاید اس کا مغربی تصوّر مُراد تھا) سے کیا تعلق ہے؟ میری شاعری اسلامی تفکّر اور فقہ کی تفسیر اور تعبیر ہے" مَیں نے عرض کیا کہ میرا مقصد یہ ہے کہ اس بات کو واضح کردُوں کہ آپ کے خیال میں فنونِ لطیفہ کا نصب العین کیا ہے، فرمایا "ہاں اس اعتبار سے مقالہ لکھا جا سکتا ہے"

اس کے بعد کچھ عرصہ علامہ چُپ رہے، شفیع صاحب آ گئے اور ان کے شانے دبانے لگے۔

مَیں نے جرأت کرکے پوچھا کہ آرٹ کے زوال پذیر ہونے کے جو محرکات ہوتے ہیں ان کے متعلق آپ کا کیسا خیال ہے، علامہ نے لیٹے لیٹے جواب دیا کہ آرٹ کی زوال پذیری دراصل اقوام کی مجموعی زوال پذیری کے تابع ہوتی ہے، جب تک خدا کو کسی قوم سے کچھ کام لینا مقصود ہوتا ہے، اور اُسے سرداری کے منصب پر فائز رکھنا منظور ہوتا ہے، اس وقت تک آرٹ زندہ اور جاندار رہتا ہے، بلکہ سب سے پہلے کسی قوم کی زوال پذیری کی علامت آرٹ کی زوال پذیری کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ علامہ یہ کہہ کر چُپ ہوئے تو نیازی صاحب نے پوچھا کہ ان حالات میں کیا شاعری سب سے پہلے متاثر ہوتی ہے، فرمایا ضروری نہیں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے جب کوئی قوم زوال آمادہ ہو جاتی ہے تو ٹھوس چیزوں سے، مغز سے، معنی سے، بیگانہ ہو جاتی ہے، چھلکے سے، شکل سے، دل بستگی بڑھ جاتی ہے، یہی آرٹ کی زوال پذیری ہے، مَیں نے عرض کیا کہ اُردو شاعری میں شاید ناسخ اور اس کے سکول کا کلام آپ کے ارشاد کی بہترین تفسیر ہے، فرمایا۔ مَیں نے ناسخ اور اس کے سکول کا کلام بہت کم پڑھا ہے، میرا اُردو ادبیات کا مطالعہ بہت محدود ہے، البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُردو کی تاریخ میں دکنی ادبیات کا حصہ نسبتاً بہت جاندار نظر آتا ہے، نیازی صاحب نے فرمایا کہ شاید اس کی وجہ یہ ہوگی۔ کہ دکنی ادبیات کو مذہب سے نہایت گہرا تعلق ہے فرمایا۔ ہاں یا یوں کہو کہ زندگی سے دکنی ادبیات کا تعلق اصلی اور اساسی ہے۔ مَیں نے کہا۔ کچھ دن ہوئے ہیں۔ رسالہ اُردو میں ایک مقالہ نگار نے میر حسنؔ اور ایک پُرانے دکنی ادیب کی مثنویوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی تھی۔ کہ دکنی شاعر کا کلام زیادہ جاندار اور پرجوش ہے۔" علامہ نے فرمایا" مقالہ نگار کا خیال ٹھیک ہوگا۔ حسنؔ کے وقت تک اُردو شاعروں میں کافی ژولیدہ بیانی پیدا ہو چکی تھی۔ یا تو کچھ کہنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ یا کہنا چاہتے تھے تو کہہ نہیں سکتے تھے۔ بلکہ جو بزرگوار کچھ کہنا چاہتے تھے ان کے کلام میں بھی ایک خاص قسم کی ژولیدہ گفتاری ہے جو ذہنی ژولیدگی اور پریشان نظری

کی خبر دیتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس قسم کی ژولیدہ گفتاری کا معیاری نمونہ غالب کا ابتدائی کلام سمجھا جائیگا کسی نے غالب کے "نسخہ حمیدیہ" والے دیوان کا ایک شعر پڑھا۔ شعر یاد نہیں۔ غالباً "ژنگ آخر۔ اور پلنگ آخر" ان قافیوں میں تھا۔ علامہ کچھ عرصہ چپ رہے۔ پھر فرمایا "کسی حد تک، لیکن غالب سے کہیں زیادہ مومن ژولیدہ گفتار ہے۔ میں خود اگرچہ مومن کے مداحوں میں سے نہیں ہوں اور اس کے اسلوبِ فکر اور اندازِ تغزل کو ایک کارنامہ نہیں سمجھتا۔ لیکن کچھ نقادوں نے غالب کے مقابلے میں مومن کو اچھالا تھا"۔ اس سلسلے کے تمام واقعات مجھے یاد آگئے اور معاً خیال آیا کہ زوال پذیر قوموں کے نقاد بھی کس قدر ژولیدہ فکر ہو جاتے ہیں کہ پریشاں گفتاری کو، ندرتِ اسلوب اور ژولیدہ بیانی کو جدتِ ادا کا لقب دیکر معایب کو محاسن بناکر پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ بلھے شاہ کی کافیوں کا ذکر آیا۔ کچھ وقت تک پنجابی شاعری اور تصوف کا ذکر چلتا رہا۔ لیکن میرے دل کو چیٹک سی لگ گئی تھی۔ کہ موقع ملے تو علامہ سے کچھ اور پوچھوں۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسلام کی زوال پذیری کے سلسلے میں ایرانی تحریکاتِ مذہبی کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ شاید اسلام کی زوال پذیری میں ان تحریکات نے کافی حصہ لیا ہے۔ جنہیں مجوسی کہا جاتا ہے اور جن کو دراصل شیعیت سے کوئی تعلق نہیں۔ فرمایا "ہاں۔ اگر اسلامی علوم و فنون اور اسلامی روایات کا چشمہ بہت کم گدلا ہوا ہے تو وہ ترکانِ عثمانی کے ہاں ہے۔ ورنہ اسلام کا چشمہ جس زمین سے گذرا ہے اس کو گدلا کر دیا گیا ہے۔ اس کا رخ پھیر دیا گیا ہے"۔ اس کے بعد کچھ عرصہ علامہ چپ رہے۔ ایک صاحب نے کسی نئی تصنیف کا ذکر چھیڑا۔ جس میں آرٹ کے فلسفے سے بحث کی گئی تھی۔ علامہ نے فرمایا "ایک جرمن مصنف کہتا ہے کہ فلسفے کے نظام دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ٹھوس وزنی۔ ان میں مغز زیادہ ہوتا ہے، دوسرے ذرا ہلکے۔ جب قومیں زوال پذیر ہوتی ہیں تو ہر ٹھوس چیز سے بیگانہ ہو جاتی ہیں"۔ میں نے پوچھا۔

آرٹ بھی ٹھوس اور ہلکا ہو سکتا ہے؟" فرمایا "ہو سکتا ہے، زوال پذیر اقوام میں آرٹ کا رس نچوڑ کر نہیں پیا جاتا۔ بلکہ پھل کی شکل بنا دی جاتی ہے، اور اس کے رنگ کو دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔"

میں نے عرض کیا۔ کہ آرٹ کی عظمت کا انحصار کس چیز پر ہے۔ شکل پر یا مغز پر۔ علامہ نے ارشاد فرمایا کہ یوں تو شکل بھی مغز ہی کا ایک پہلو ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آرٹ کی عظمت کا معیار مغز کی صحت مندی اور توانائی پر ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر علامہ چپ ہوئے تو اُن کے ایک پرانے دوست تشریف لے آئے۔ انہوں نے مجھے آنکھ کے اشارے سے بولنے سے منع کیا۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد میں نے اور راجہ صاحب نے اجازت چاہی۔ اجازت چاہی میں رسماً لکھ گیا ہوں۔ ورنہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ علامہ پر یہ شعر صادق آتا تھا ؂

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو

گیر دار و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

اقبال کے ہاں

خضر تمیمی ایم اے ایل ایل بی

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی کے متعلق، ایک ہیچدان کا کچھ کہنا، چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ لیکن ایک صحبت کی یاد میرے دل سے محو نہ ہو گی،

۱۹۳۶ء قادیانیت کی شدید مخالفت کا زمانہ تھا۔ ایک طرف تو مجلس احرار اور دوسرے علمائے اسلام اپنی تحریروں اور تقریروں سے "قصرِ خلافتِ قادیان' کی بنیادیں متزلزل" کر رہے تھے اور دوسری طرف مرزائی صاحبان اپنی طویل اور قاطع دلیلوں سے "سعید روحوں" کو راہِ راست پر لا رہے تھے۔ ان ایام میں حضرت ممدوح علیل تھے۔ لیکن طرفین کی وزنی دلیلیں، سیدھے سادھے نوجوانوں کو سوچنے کا موقعہ ہی نہیں دے رہی تھیں۔

اس لئے کئی ایک تشنگانِ ہدایت ' رہنمائی حاصل کرنے کیلئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ محسوس کرتے ہوئے' کہ نوجوان بڑی بیتابی کے ساتھ' آپ کے ارشاداتِ عالیہ کے منتظر ہیں۔ آپ نے اپنا شہرہ آفاق مضمون" اسلام اور قادیانیت" شائع فرمایا۔ جس سے کئی ایک گتھیاں سلجھ گئیں۔ اور وہ دلائل جو سیاق و سباق کا لحاظ رکھے بغیر' سادہ دل نوجوانوں کو گمراہ کر سکتی تھیں۔ تارِ عنکبوت کی طرح کمزور نظر آنے لگیں۔ اور نوجوانوں کی متوقعہ بیراہ روی کا مکمل سدِ باب ہو گیا۔

پنڈت جواہر لال صاحب نہرو کو اس مضمون کے بعض حصے سمجھ میں نہ آئے تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں اسلامی تعلیمات اور ماحول سے واقفیت نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے" ماڈرن ریویو" (کلکتہ) میں مذکورہ مضمون پر تنقید لکھی جس کا جواب حضرت علامہ" نے" اسلام اور احمدیت" کے عنوان سے تحریر فرمایا۔ اس کی اشاعت سے دلوں کے رہے سہے شکوک بھی رفع ہو گئے۔

قصہ کوتاہ ہر طرف قادیانیت کے موافق یا مخالف تذکرے شروع تھے۔ جن سے مساجد اور عام جلسہ گاہوں کے علاوہ مختلف کوٹھیوں کے خلوتکدے بھی خالی نہ تھے ان ایّام میں یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ دُنیا میں صرف دو ہی فریق رہ گئے ہیں۔ ایک وہ جو قادیانیت کا مخالف ہے اور دوسرا وہ جو اس کے موافق۔ میں نے اسی سال پنجاب یونیورسٹی کے ایم۔اے (فارسی) کا امتحان دیا۔ حضرت ممدوح ہمارے ایک پرچے کے ممتحنِ اعلیٰ تھے۔ اور اس میں ممدوح نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں خلافتِ الٰہیہ اور ممّدقہ کے نظریئے کے متعلق ایک سوال پوچھا تھا۔ جسمیں ضمنی طور پر قادیانیت بھی زیرِ بحث آجاتی تھی۔

اپنے دوست' صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسّم کے ساتھ" جاوید منزل" میں' مجھے حضرت ممدوح کی زیارت نصیب ہوئی۔ ہمارے جانے سے پیشتر' قائدِ اعظم مسٹر محمد علی جناح اکسبِ فیض کے بعد موٹر میں سوار کوٹھی

سے نکل رہے تھے۔ آپ نے دروازہ تک ان کی مشایعت کی۔ اور پھر ہماری طرف توجہ فرمائی۔ صوفی صاحب کو دیکھ کر تو آپ بس نہال ہی ہو گئے۔

ڈیوڑھی میں ایک کھری چارپائی بچھی تھی۔ جس کے سرہانے چھوٹا سا تکیہ دھرا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ پائینتی کی طرف کوئی کپڑا نہ تھا۔ اس پر ایک کتاب کھلی ہوئی پڑی تھی۔ جس کے ایک خاص مقام پر پنسل دھری تھی۔ ایک کاپی شاید مختصر یادداشتوں کے لئے پاس تھی۔ حضرت ممدوح صرف سادہ سے کرتے اور شلوار میں ملبوس تھے۔ آخرالذکر پنجاب کی پانچ گزی شلوار اور پاجامے کے بین بین تھی۔ اللہ اللہ مشرق و مغرب کے جملہ علوم کا ماہر خرابیٔ صحت اور زیادتیٔ عمر کے باوجود اب بھی اس شان سے ہمہ تن مطالعہ تھا!

حضرت علامہ اور ہم "جاوید منزل" کے گول کمرے میں گئے۔ جس کی مشرقی فضا سے ہم بہت متاثر ہوئے۔ سب سے پہلے ایک قلفی، دائ سادہ، فرشی حقہ لایا گیا۔ جس میں نرم تمباکو بھرا تھا۔ میں نے کڑوے تمباکو کا ذکر چھیڑا۔ تو آپ نے جھنگ کے تمباکو کو سراہا۔ لیکن گلے کی تکلیف کے باعث اس سے لطف اندوز ہونے سے معذوری ظاہر فرمائی۔ ہم میں سے ممدوح کے ساتھ حقہ پینے کا شرف صرف صوفی صاحب قبلہ کو حاصل ہوا۔

ادبیات پر گفتگو شروع ہونے پر مشرق و مغرب کے ادبیات زیر بحث آ گئے۔ جس میں حضرت علامہ سمندر کی سی وسعت کے مالک معلوم ہوتے تھے۔ اور ان کے تبحر علمی کا یہ عالم تھا۔ کہ جس موضوع پر گفتگو فرماتے تھے۔ یہی معلوم ہوتا تھا۔ گویا ساری عمر آپ نے اسی کے مطالعہ میں صرف فرمائی ہے۔ ضمناً پنجاب کی ادبی روایات پر بھی بات چیت ہوئی۔ اور آپ نے فرمایا۔ کہ آئندہ ان کے برقرار رکھے جانے کی امیدیں دو نوجوانوں سے وابستہ نظر آتی ہیں۔ ایک۔ (مخدومی پرنسپل) تاثیر ایم اے پی ایچ۔ ڈی کیمبرج ایم اے او کالج امرتسر اور دوسرے محترمی محمد اسد خانصاحب آسد ملتانی بی۔ اے۔

علی بخش چائے لایا۔ اور آپ نے میٹھی چائے پر نمکین کو ترجیح دی۔ چائے کے ساتھ مابعدیات کا دور شروع ہوا۔ میں نے "جاوید نامہ" کی ان تصریحات کے متعلق استصواب کیا ع

آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد

آپ نے جواب میں قادیانیت اور اس کے بانی کی مختلف تحریروں اور دعاوی کے پیش نظر ظاہر فرمایا کہ ثانی الذکر کی شخصیت نفسیاتی مطالعہ کے لئے بہت موزوں ہے۔ صوفی صاحب بولے کہ آپ سے بڑھ کر موضوع کا تجزیۂ نفسی کون کر سکے گا۔ ارشاد ہوا۔ کہ موضوع واقعی بہت دلچسپ ہے۔ لیکن صحت کی خرابی مانع ہے کوئی نوجوان اس کام کے لیئے اُٹھے تو اُس کی ہر ممکن امداد اور رہبری کرونگا۔ اس کے بعد آپ نے ان نقصانات کو گنایا۔ جو قادیانیت کو صحیح تسلیم کرنے کی صورت میں مذاہب عالم کو برداشت کرنے پڑے۔ پھر مختلف مذاہب سے اسلام کے امتیازات کو بشرحِ تمام واضح کر کے ارشاد فرمایا۔ کہ اسلام نہ صرف دُنیا کے مذاہب میں سے کامل ترین مذہب ہے۔ بلکہ اس سلسلے میں جو ارتقائی بلندیاں انسان کو ودیعت کی گئی ہیں ان کی بھی آخری کڑی ہے آپ اس نتیجے پر پہنچے۔ کہ قادیانیت کی تعلیم اسلام کی تیرہ سو سال کی علمی اور مذہبی ترقی کے کس طرح منافی ہے سب سے زیادہ افسوس اس بات پر آپ نے ظاہر فرمایا۔ کہ قادیانیت کے ارکانِ اعلیٰ، اسلافِ صالحین کی تحریروں کو محرف کر دیتے ہیں اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ انہیں ایک خاص موضوع پر کسی مسلمہ کتب کا علم تک بھی نہیں ہوتا۔ مولوی محمد علی صاحب ایم اے ایل ایل بی امیر جماعت احمدیہ لاہور کا ذکر بھی درمیان میں آتا رہا۔ آخر کار میں نے عرض کیا۔ کہ فریقین کی آراء کو ایک طرف رکھتے ہوئے۔ آپ مسئلہ "ختم نبوت" کے متعلق کچھ ارشاد فرمائیں آپ نے فرمایا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الخ کی صریح نص قرآنی کے بعد اجرائے نبوت کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ میں نے عرض کیا۔ کہ آخر اسلام میں اور فرقے بھی تو ہیں۔ صرف قادیانی صاحبان کی مخالفت

ہی کیوں کی جائے۔ اس پر ارشاد ہوا۔ کہ ان کا اختلاف بنیادی نہیں۔ بلکہ فروعی ہے اور حقیقت میں اسلامی فرقے مختلف گروہ ہائے خیال (**Schools of thoughts**) ہیں جن کے اختلافات فقہ پر مبنی ہیں۔ ہر ایک فرقہ اسلام کے مسلمات پر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن قانون اسلامی کے بعض حصوں کی تشریح میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتا ہے۔ فقیہوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔ کہ تعجب ہوتا ہے کہ یہ اصحاب "خشک" ہونے کے باوجود حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں کس قدر حساس واقع ہوئے ہیں۔ ایک صاحب اُٹھتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے فلاں کام اس طرح کیا۔ اس دعوے کی تائید میں وہ ہر ممکن ثبوت (قرآن حدیث یا دیگر ماخذ سے) بہم پہنچاتے ہیں۔ دوسرے صاحب اس کی تردید میں فرماتے ہیں کہ نہیں یہ کام حضور نے یوں سرانجام دیا۔ وہ اپنے دلائل الگ پیش کرتے ہیں۔ جس سے مستفسر کو حضورؐ کی مبارک زندگی کے ایک خاص پہلو کے متعلق مؤثق معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ امر ہے کہ جہاں کہیں حضورؐ کا ذکر آیا۔ ان "جذبات سے عاری مصنفین" کے دلوں میں محبت کے سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگ گئے۔ ان حضرات کی زندگی کا محبوب سرمایہ حضورؐ کا اسوۂ حسنہ ہے جس کے ہر پہلو کو اس قدر حزم و احتیاط سے محفوظ و ملحوظ رکھتے ہیں۔ کہ حیرت ہوتی ہے۔ یہاں آپ نے **Gealously Guard** کرتے ہیں کا فقرہ ارشاد فرمایا تھا۔ اب تم خود اندازہ کر لو کہ ایسی محبوب منفرد ہستی کے جملہ اعزازات کے لئے کسی اور صاحب کو چن لینا، اسلامی علوم کی فلک رفعت عمارت کے انہدام کے مترادف نہ ہوگا؟ باتیں مزا ئیت کے گو اُلفت زندگی اور انہی حالات میں حضور کے مبارک نعال کے تفاوت کی وضاحت کرتے ہوئے آپ آبدیدہ ہو گئے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں بہتے ہوئے آنسوؤں سے ہم شکوک کے داغوں کو دھوتے۔ اور دلوں کو روشن کرتے، صوفی صاحب کے دولتکدے پر لوٹ آئے۔ سچ ہے ؎

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا　　دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

بزمِ اقبال

سعادت علی خاں ایم۔اے

مَیں جھنگ سے ایک دن کے لئے لاہور آیا۔ عبداللہ یوسف علی صاحب نے لنڈن سے اپنے پمفلٹ "اخلاقی تعلیم" کی چند کاپیاں مجھے بھیجی تھیں کہ انہیں اربابِ علم و ذوق کی خدمت میں پیش کر دُوں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ مَیں "اخلاقی تعلیم" کی ایک کاپی لے کر علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ حسبِ معمول اہلِ شوق کا ایک گروہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کی نشستگاہ میں بیٹھا ہُوا اُن انمول موتیوں کو چُن رہا تھا۔ جو علامہ موصوف دورانِ گفتگو میں یُوں بکھیرا کرتے تھے کہ ہم میں ہر ایک اِس لُٹتی ہُوئی دولت کی افراط و ارزانی کو دیکھ کر اپنے کو جواہرِ معرفت و رُوحانیت سے مالا مال تصوّر کرتا تھا۔ کہاں ہے اب وہ محفل اور وہ بےمثل

آواز؟ اس کا جواب موت سے پُوچھیئے۔ میری غم زدہ رُوح اور کانپتا ہُوا قلم کیا اس کا جواب دینگے۔

میرے کمرہ میں داخل ہونے پر اُس غیر فانی تبسّم سے جس پر ہزار الفاظ قربان ہوں مجھے اپنے پاس کی ایک کرُسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سلسلۂ گفتگو کشمیر سے متعلق تھا۔ کشمیر میں آزادی کی رُوح صدیوں کے تشدّد و جبر کے بعد اپنا سر اُبھار رہی تھی۔ ریاست اُسے ہر طریق سے پھر دبانا چاہتی تھی۔ لیکن علامہ مرحوم فرما رہے تھے کہ یہ ناممکن ہے۔ یہ رُوح کی چنگاری ہے۔ شعلہ بن کر رہے گی۔

محفل میں سے ایک صاحب نے کشمیریوں کی غرُبت و جہالت کا ذکر کیا۔

مرحوم مُسکرا دیئے۔ غربت و جہالت قوتِ ایمان و حُرّیت کی راہ میں نہ کبھی سدِ راہ ہو سکے ہیں اور نہ ہوں گے۔ ہم تو امی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی اُمت ہیں۔ مُسلمان کے لئے غرُبت و جہالت کی آڑ لینا اس کی رُوحانی کمزوری کی پکّی دلیل ہے۔

اِن الفاظ نے سامعین پر ایک رقت سی طاری کر دی۔ علامہ مرحوم نے غالباً اس کا احساس کرتے ہوئے بات کا رُخ پلٹ دیا۔ فرمانے لگے مَیں تو نبی ہوتا ہوتا رہ گیا۔ حالات نے "جاوید نامہ" کی طباعت اور اشاعت میں تاخیر کر دی۔ ورنہ کشمیر کے اس ہیجان کو تو مَیں مُدت سے "دیکھ" رہا تھا۔

اب میری طرف رجُوع کیا۔ مَیں نے "اخلاقی تعلیم" کی کاپی پیش کر دی۔ مَیں علم النفس کا طالب علم ہُوں۔ جانتا ہُوں کہ ایک اعلیٰ ترین شخصیت جس طرح پر اپنی توجہ کسی نقطۂ خاص پر مبذول کر سکتی ہے اس کی صلاحیت عام آدمیوں میں بالعموم نہیں ہوتی۔ جُونہی علامہ مرحوم نے "اخلاقی تعلیم" کے ورق الٹنے شروع کئے مَیں خوش ہُوا کہ اس بات کے عملی تجربہ کا موقعہ ہاتھ آگیا۔ کوئی دس پندرہ منٹ تک پمفلٹ کے پینتیس چالیس صفحوں پر سرسری نظر ڈالتے رہے۔ لیکن اس عرصہ میں وہ گویا ہم میں وہاں موجُود ہی نہ تھے۔ کئی ایک

حضرات نے کشمیر کے متعلق چند ایک سوالات بھی کئے لیکن علامہ مرحوم نے ایک حرف تک بھی نہ سُنا۔
اب مجھے معلوم ہُوا کہ ایک طرف کشمیر کے ایک مذہبی تعلیم یافتہ نوجوان بھی بیٹھے ہیں۔ اور علامہ مرحوم کی خدمت میں مالی امداد حاصل کرنے کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں۔

انہیں مخاطب کر کے فرمایا: تمہارا اس وقت پنجاب میں ہونا اگر دردناک نہیں تو تعجب انگیز ضرور ہے۔ تُم بیکاری کا رونا رو رہے ہو۔ اور تمہارے ہموطن اپنی آزادی اور حقوق کے لئے طرح طرح کی قربانیاں کر رہے ہیں۔ غربت اور بھوک کی شکایت کرتے ہو۔ اپنے وطن کو واپس چلے جاؤ۔ آزادی کی رو میں کُود پڑو۔ اگر قید ہو جاؤ گے تو کھانے کو تو ضرور مل ہی جائیگا۔ اور اس گداگری سے بچ جاؤ گے۔ اگر مارے گئے تو مفت میں شہادت پاؤ گے اور کیا چاہتے ہو؟ اگر قرآن نے تمہیں یہ بھی نہیں سکھایا تو تم اور سیکھے کیا ہو؟ اگر کشمیر جانا ہو تو کرایہ کے پیسے میں دے دیتا ہُوں

نوجوان نے گردن جھکالی۔ سب خاموش تھے۔ میرا گاڑی کا وقت قریب تھا۔ اجازت لے کر رُخصت ہُوا۔

شام ہونے کو تھی۔ سُورج کی آخری شعاعیں شام کے پھیلتے ہوئے دُھندلکے سے برسرِ پیکار تھیں۔ علامہ مرحوم کو کوٹھی کے برآمدے میں اکیلے بیٹھا دیکھ کر اپنی قسمت پر رشک کرنے لگا۔ مَیں نے دل میں کہا "رموز"۔ "اسرار"۔ "زبورِ عجم"۔ "پیامِ مشرق"۔ "جاوید نامہ"۔ آج تو کچھ سبق پڑھ کر جاؤنگا۔
سلام عرض کر کے بیٹھ گیا۔ ارشاد ہُوا شپنگلر کی "زوالِ مغرب" decline of the west پڑھی؟ خوب کتاب ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز کی بہترین کتابوں میں سے ہے۔
مَیں اس کتاب کی پہلی جلد پڑھ چکا تھا۔ دوسری نہ پڑھی تھی۔ شپنگلر کے اچھوتے نظریئے نے